آدھا سفر

ہاشم علی خان ہمدم

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

بارہواں مجموعۂ کلام

ہاشم علی خان ہمدمؔ

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com

تعارف

نام	:	ہاشم علی خان ہمدمؔ
ولدیت	:	زمرد خان
تاریخ پیدائش	:	۷؍جولائی ۱۹۷۳ء
تعلیم	:	ایم اے اردو، ایم اے انگریزی، بی ایڈ (پنجاب یونی ورسٹی لاہور)
جائے پیدائش	:	خودہ شریف تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک
پیشہ	:	درس وتدریس
سرکاری ملازمت	:	اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ
ادبی خدمات	:	بانی ومنتظم موج غزل ادبی فورم (فیس بک)
اصناف سخن	:	حمد، نعت، غزل، نظم، سلام، منقبت، طنزومزاح
تصانیف	:	۱۔موجِ کرم (حمدونعت)
		۲۔پانچواں موسم (غزلیات)
		۳۔آئینہ سچ بولتا ہے (غزلیات)
		۴۔موج غزل (طرحی غزلیات)
		۵۔محبت کی زباں (طرحی غزلیات)
		۶۔دھوپ کی دیوار (طرحی غزلیات)

۷۔ چراغِ فکر (طرحی غزلیات)

۸۔ جہانِ خواب (طرحی غزلیات)

۹۔ چشمِ تماشا (طرحی غزلیات)

۱۰۔ سراب سے آگے (طرحی غزلیات)

۱۱۔ تیسرے کنارے پر (طرحی غزلیات)

۱۲۔ آدھا سفر (طرحی غزلیات)

۱۳۔ نمودِ سحر (طرحی غزلیات)

۱۴۔ آخری چراغ (غزلیات)

۱۵۔ چراغِ حرف (غزلیات)

۱۶۔ غزل پوش (غزلیات)

۱۷۔ دم (دیوان)

۱۸۔ سبیلِ کرم (نعتیہ مجموعہ)

۱۹۔ طیبۂ جاں (نعتیہ نظمیں)

۲۰۔ خواب سراب (نظمیں)

۲۱۔ روشنی کے پھول (سلام و مناقب)

۲۲۔ سیلفیاں (طنز و مزاح)

پتہ : خودہ شریف، تحصیل حسن ابدال، ضلع اٹک۔

فون نمبر : 0311-5509555

انتساب

موج غزل کے منتظمین

نوید ظفرؔ کیانی

بیناؔ کیانی

قدسیّہ ظہور

اور

نادیہ سحرؔ

کے نام

کوئی تو اٹھاتا تھا قدم میری طرف بھی
کوئی تو مرا آدھا سفر کاٹ رہا تھا

موجِ غزل

کے پہلے تریسٹھ مشاعروں میں

کہا گیا کلام

کسی کی موج میں دھمال ڈالتا ہوا دل

غبارِ عشق میں، مٹی کے بال و پر میں رہا

مشتری ہوشیار باش

کتاب کا نام آدھا سفر۔

شاعر ہاشم علی خان ہمدمؔ۔

وضاحت یہ ہاشم علی خان ہمدمؔ کے کلام کا بارھواں مجموعہ ہے جسے برقی کتاب کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

کاپی رائٹ جملہ حقوق بحقِ شاعر محفوظ۔

اِجازت اِس کتاب کو حوالہ جات یا غیر کاروباری نقطۂ نظر سے استعمال کیا جا سکتا ہے یا اِس کا اشتراک کیا جا سکتا ہے تاہم اس میں کسی قسم کی کانٹ چھانٹ یا اس کی شکل تبدیل کرنے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ اِس کے لئے شاعر کی پیشگی اجازت ازحد ضروری ہے۔

صفحات ۲۱۸

سالِ اشاعت دسمبر ۲۰۲۳ء

ہدیہ دعائیں۔

پبلشر مکتبۂ ارمغانِ ابتسام۔ اسلام آباد، پاکستان۔

برقی ڈاک itshamdam@gmail.com

ارکائیو ربط archive.org/details/@nzkiani

(جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ ہیں)

کتاب: آدھا سفر

شاعر: ہاشم علی خان ہمدم

پتہ: خودہ تحصیل حسن ابدال ضلع اٹک

itshamdam@gmail.com

0311-5509555

سن اشاعت: 2023ء

ایڈیشن: اول (برقی اشاعت)

سرورق: نوید ظفر کیانی

ناشر: مکتبہء ارمغانِ ابتسام، اسلام آباد

قیمت: مفت ڈاؤن لوڈ

ویب سائٹ لنک: archive.org

فہرست

پیش رس

منزل کی طرف بڑھتا ہر قدم جستجو کا سفر ہے۔جوں جوں سوچ کے پیاسے قدم پیش قدمی کرتے ہیں منزل قریب ہونے لگتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ منزل ہر قدم قریب آ رہی ہے۔مسافر اور منزل کا دو طرفہ آدھا سفر چاہت کا سفر ہے یہ آدھا سفر سرشاری اور چاہے جانے کا مکمل سفر ہے جس میں منزل مراد ہے رستے کے سراب کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں آخر کار مطلع صاف ہو جاتا ہے اور منزل سے پھوٹتی روشنی استقبال کرتی ہے۔محبت کا سفر بھی دھڑکنوں کی لے پر جستجو کو مہمیز کرتا سفر ہے جو ادھورا رہ ہی نہیں سکتا ۔ایک مسافر تھک بھی جائے تو دل کی طرف بڑھتا ہم سفر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔زندگی میں ہر چاہنے والا اسی آدھے سفر کی سرشاری میں مست رہتا ہے ۔ محبتوں سے مزین زندگی نعمتِ خداوندی ہے کہ مجھے ان گنت چاہتیں میسر ہیں۔ میں تھک کے بیٹھ بھی جاؤں(اگرچہ محبت تھکنے نہیں دیتی)تو میری دھڑکن کی طرف بڑھتے قدم رک نہیں سکتے کیونکہ یہ وہ سفر ہے جو بے مراد نہیں۔قدم قدم محبت کے پھول کھلتے ہیں ہر خواب کی تعبیر کسی اور خواب کا پیش خیمہ ہوتی ہے آنکھیں بے خواب نہیں رہ سکتیں تو تعبیر کے قدم کیسے رک سکتے ہیں؟

تخلیق کی خواہش بھی من چاہے خیال کو شعر کرنے کی جستجو ہے۔وجدان کے پر خیال کو زیر دام لانے کی جستجو میں کھلتے ہیں تو خیال کا

آدھا سفر

سفر فکر کی اساس اور احساس کی تہہ سے نمود ار ہو کر وجود پانے لگتا ہے۔خواہش کا آدھا سفر مکمل شعر میں ڈھل جائے تو شعر یت کی منزل ہم آغوش لگتی ہے۔

موج غزل بھی جستجو ئے تخلیق کا سفر ہے جو بے مراد نہیں بلکہ اپنے دامن میں گوہرِ حرف کی تاب تک منزل سے ہم کنار ہے۔میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ موج غزل کا بامراد فکری اور تخلیقی سفر جاری و ساری ہے۔

فیس بک نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔مختلف ادبی فورم اپنے اپنے انداز میں ادب کی تخلیق ، ترویج ،تحقیق اور تنقید کی جہتوں کو لیے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔موج غزل ایک اہم ادبی فورم ہے جس نے منفرد ادبی خدمات سرانجام دی ہیں جو امتیازی سر گرمیوں سے اپنا ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔موج غزل کی بنیاد ۲۰ اپریل ۲۰۱۶ ء کو رکھی گئی جس میں نوید ظفر کیانی ، روبینہ شاہین بینا اور قدسیہ ظہور میرے ساتھ ابتدائی منتظم تھے۔ ہمارے ادبی قافلے میں بہت سے جید اور خوب صورت شعرا شامل رہے جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت سے موج غزل کو رونق بخشی۔جن میں شعیب خان ، عرفان قادر ، میاں ارشد منیر ،سید جاوید بخاری،احمد علی،قمر آسی،جیا قریشی، افروز رضوی، شہناز رضوی،ترنم شبیر ،رعنا حسین،نور جمشید پوری اور ذہینہ صدیقی ابتدائی معاونین میں شامل رہے۔ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ڈاکٹر عزیز فیصل ، رحمان حفیظ، ڈاکٹر اسد مصطفے ، شاہین فصیح بخاری ، ضیا شہزاد ، امین جس پوری ، رہبر صمدانی اور کئی جید شعرا نے موج غزل کو رونق بخشی اور اکثر مشاعروں میں شریک رہے۔محترمہ ایم زیڈ کنول ، دلشاد نسیم،روحی طاہر اور الماس شبی نے بھی موج غزل کے مشاعروں میں گاہے بگاہے حصہ

لیا ۔ ۲۰۱۷ء میں خوب صورت شاعرہ نادیہ سحر نے موج غزل کی میز بان کی حیثیت سے موج غزل کی رونق میں اضافہ کیا اور بھر پور محنت اور باقاعد گی سے موج غزل کے مشاعروں کی کامیابی میں اپنا بھر پور کردار ادا کیا۔خوب صورت شاعر رضا طیبی موج غزل کے مستقل میز بان ہیں جو باقاعد گی سے موج غزل کی ترقی اور کامیابی میں قدم بہ قدم ہمارے ساتھ رواں دواں ہیں۔موج غزل کے ممبران کی تعداد ہزاروں میں ہے اور سینکڑوں جید شعرا موج غزل کے ادبی کارواں کا حصہ ہیں۔ میں سب کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔میں تخلیقی سفر میں موج غزل کو ایک اہم سنگ میل سمجھتا ہوں جس کی بدولت مجھے محبت ، شہرت اور عزت ملی ہے۔میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ جس نے موج غزل ادبی فورم کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ودیعت کیا ہے۔

موج غزل میں ابتدائی پچاس مشاعرے طرحی مصرعوں پہ منعقد ہوئے مگر اس کے بعد سے اب تک تین سو سے زائد مشاعروں میں غیر طرحی اور نظمیہ مشاعروں کا سلسلہ جاری ہے۔جن میں منفرد قوافی ، پابند حرفی ردیف ، منفرد ردیف ، منفرد بحر اور اصناف سخن رنگ نمایاں ہیں۔

موج غزل میں جید شعرا شریک ہوتے ہیں جن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے ۔موج غزل اب مشق سخن سے بڑھ کر تخلیقی ادبی مرکز بن چکا ہے۔نوید ظفر کیانی اور روبینہ شاہین بینا کہنہ مشق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ناشر بھی ہیں ۔ارمغان ابتسام کے نام سے ایک خوب صورت جریدہ برقی صورت میں شائع کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ برقی کتب کی اشاعت کا خوب صورت اہتمام کرتے ہیں۔موج غزل میں کہے گئے کلام کی خوب صورت تزئین و آرائش کے ساتھ ساتھ خوب صورت برقی مجلہ کی صورت میں اشاعت بھی کی جاتی ہے۔

زیر نظر شعری مجموعہ " آدھا سفر "موج غزل کے پہلے تر یسٹھ مشاعروں میں کہی گئی طرحی غزلیات پر مشتمل ہے۔ جس کی برقی اشاعت کا اہتمام موج غزل کے منتظمین نوید ظفر کیانی اور روبینہ شاہین بیناؔ نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادبی سفر میں ہمیں کامیاب اور بامراد فرمائے۔ آمین۔

ہاشم علی خان ہمدمؔ

☆

آئینے میں عجیب منظر تھا
کون تھا جو مرے برابر تھا

میری پرواز لامکانی تھی
میں محبت کا آخری پر تھا

زلزلے نے مکان چھین لیے
اس خرابے میں کون بے گھر تھا

جس کو سمجھا تھا میرا بازو ہے
آستیں میں چھپائے خنجر تھا

آدھا سفر

میں نے ہنس کر کیا قبول جسے
غنچۂ گل اصیل پتھر تھا

دھجیاں تھیں سفید آنچل کی
شہر کے راستے میں کیکر تھا

اس کے چہرے پہ سرخ رنگِ حیا
سونے چاندی سے بڑھ کے زیور تھا

سنگ زادوں پہ اتنی حیرت کیوں؟
آئنہ بھی تو ایک پتھر تھا

عرصہ ءگل تھا پانچواں موسم
دل اگرچہ سرائے صرصر تھا

آنکھ سورج سے کب ملاتے تھے؟
دھوپ زادوں کا عشق محشر تھا

آدھا سفر

در حقیقت وہی تھا رنگِ دروں
آئنے سے جو عین باہر تھا

زندگی تھی مرے تعاقب میں
خواہشوں کا حسین لشکر تھا

پستیوں سے بھری بلندی تھی
کوئی نیچے تھا کوئی اوپر تھا

لاج رکھی تھی میرے مولا نے
کون ورنہ غریب پرور تھا؟

جی رہے تھے منافقت میں لوگ
کوٹ کالا سفید کالر تھا

اب تو اپنی خبر نہیں ہمدم
خود کو میں بھی کبھی میسر تھا

☆

حرفِ تازہ نہ مصرعۂ تر تھا
میر جیسا نہ کوئی نشتر تھا

حیرتی ہوں میں رائگانی پر
اس طرح یہ جہان کیوں کر تھا

بارشوں نے کیا مجھے سیراب
یہ علاقہ تو کب کا بنجر تھا

رات کاٹی تھی بے قراری میں
خواب زدگی تھی، دیدہ ء تر تھا

یہ تو تاریخ ہی بتائے گی
کون کم تر تھا؟ کون برتر تھا؟

جھوم اٹھی صدائے موج غزل
اس کے لہجے میں شعر منتر تھا

ہم نے بربادیوں سے رہ پائی
راہ زن ہی ہمارا رہبر تھا

میں نے سائے کے ساتھ چلنا تھا
اور سورج بھی میرے سر پر تھا

بولتا تھا حسین لہجے میں
میر جیسا کوئی سخن ور تھا

کس کی خوشبو قیام کرتی تھی
کوچہ ء جاں مرا معطر تھا

تیرگی نے جلا دیا لوگو!
روشنی سے جو گھر منور تھا

میرا اپنا مکان تھا ورنہ
دشت میں بھی کرائے کا گھر تھا

جس نے جاں دی وفا کی حرمت پر
بندہء حر تھا، آدمی نر تھا

دے رہی ہے اذان موجِ غزل
سب سے پہلا سخن ھو اکبر تھا

میرے دامن میں پل رہا تھا کہیں
کوئی کژدم تھا یا کہ اژدر تھا

المیہ ہے یہ آگہی ہمدم
یوں نہ ہوتا تو اور بہتر تھا

☆

خواہشوں کی ترجمانی اور ہے
خواب سے نکلی کہانی اور ہے

اور ہے دشت جنوں کا بانکپن
سات دریاؤں کا پانی اور ہے

ہم تو سورج ہیں دیارِ شام کے
قریہ ء شب کی نشانی اور ہے

کون کرتا ہے بھروسہ عشق پر؟
حسن میرے یار جانی ! اور ہے

دشمنوں کی بے رخی کا رنگ اور
دوستوں کی میزبانی اور ہے

تیر ترکش میں پڑے ہی رہ گئے
جو کماں خود پر نہ تانی اور ہے

دوریوں میں قربتوں کا لمس ہے
ہجر کی ساری کہانی اور ہے

گھٹ رہی ہیں قیمتیں انسان کی
شہر میں بڑھتی گرانی اور ہے

کیا مرا رنگِ تغزل تو نہیں؟
کیا مرے خوابوں کی رانی اور ہے؟

حرف ریزی ہے سرِ موجِ غزل
رنگِ غالب، میر خوانی اور ہے

پیش منظر ہے سرِ لوح جہاں
آئنے کی عکس خوانی اور ہے

دھڑکنوں میں فاصلہ کچھ بھی نہیں
بات لیکن درمیانی اور ہے

اور ہے ہمدم ترا ذوق نظر
اور وہ خوشبو کی رانی اور ہے

☆

چاک پر رکھی کہانی اور ہے
ورنہ ساری خاک دانی اور ہے

خوش نہیں آتی مجھے گھر کی فضا
ہاں دیارِ لامکانی اور ہے

عقل کو اوہام سے فرصت نہیں
عشق میں جوگی، گیانی اور ہے

زندگانی ہے بڑھاپے کا سفر
موج میں گزری جوانی اور ہے

تیشۂ دل نے بڑھایا ہے جنوں
موجۂ خوں کی روانی اور ہے

سات رنگوں سے بنی ہے سرزمیں
آٹھواں رنگ آسمانی اور ہے

کون لائے دل کے دریا میں سکوں
تند موجوں کی روانی اور ہے

توڑ سکتی ہے ترا دستِ جنوں
ظلم پرور! بے زبانی اور ہے

عشق میں آزاد بندہ ہوں مگر
دل پہ تیری حکمرانی اور ہے

دوستوں نے جب سے تھاما ہے مجھے
دشمنوں کی مہربانی اور ہے

تیرگی کا دور ہے ہر سو مگر
روشنی کی جاودانی اور ہے

بحر تو آسان لگتی ہے مگر
رنگِ غالب میں نبھانی اور ہے

اور ہے موج غزل کی داستاں
اور ہمدم کی زبانی اور ہے

☆

سرِ آئینہ ، پیچ دیوار کیا تھی؟
مرے ہم نشیں تیری گفتار کیا تھی؟

کٹا رائگانی میں سارا زمانہ
مرے عہد کے سر پہ دستار کیا تھی؟

رگ و پے کو مسرور کس نے رکھا ہے
اگر تو نہیں تھا تو مہکار کیا تھی؟

ابھی تک ہے زنداں میں ہنگام برپا
صدائے جنوں میں وہ جھنکار کیا تھی؟

زمانے کے برزخ میں رکھی گئی جو
زمیں پر اتاری گئی نار کیا تھی؟

سرِ موجۂ گل بہاری سماں تھا
مرے دل کی دھڑکن بھی گل زار کیا تھی؟

شبِ وصل کیا دل کی روداد چھیڑیں
سرِ ہجر گزری جو دشوار کیا تھی؟

سبھی اپنی اپنی انا کاٹتے تھے
کٹائی کے موسم میں ونگار کیا تھی؟

مرا تیسرا رخ بتائے گا ہمدم
رہی مجھ سے دنیا جو بے زار کیا تھی؟

فریبِ تماشا سے دوچار کیا تھی؟
مری آنکھ ایسی سزاوار کیا تھی؟

سخن در سخن خوں رواں ہو رہا تھا
یہ موجِ غزل اور سرکار کیا تھی؟

نہ ہونے میں کیسا سکوں تھا میسر؟
مری ذات ہونے سے لاچار کیا تھی؟

سبھی مفتیوں نے اسے مار ڈالا
کسی کی ذرا سوچ بیمار کیا تھی؟

مسلسل تماشے میں رکھا گیا میں
مری آنکھ دنیا میں بے دار کیا تھی؟

میں دل کے سمندر میں اترا ہوا تھا
جنوں سے خودی میری پیکار کیا تھی؟

مرے زاویے دائرے میں نہیں تھے
مری قوس کیا؟ میری پرکار کیا تھی؟

پون در پون زندگی کٹ گئی ہے
ہواؤں کے لہجے میں تلوار کیا تھی؟

محبت نے باندھا ہوا تھا وگرنہ
ہمیں دور جاتے ہوئے عار کیا تھی؟

مجھے سانس لینا گوارا ہوا تھا
وگرنہ محبت مرے یار کیا تھی؟

گھڑی دو گھڑی کا فسانہ تھا ہمدم
کہانی ہماری مزے دار کیا تھی؟

کوئی خوب صورت سی گل نار کیا تھی؟
مری آگہی بھی ضیا بار کیا تھی؟

مجھے میری آوارگی نے گزارا
گھڑی دو گھڑی میری بے کار کیا تھی؟

سمندر مجھے راستہ دے رہا تھا
بھنور سے بچاتی وہ پتوار کیا تھی؟

مجھے اور جینا تھا لیکن ہوا کیا؟
مری زندگی بھی وفادار کیا تھی؟

بروں سے دروں تک ہر اک نقش دیکھا
سراپا نظر شوقِ دیدار کیا تھی؟

مسلسل کوئی خوف لو دے رہا تھا
ہوا بھی دیے کی مددگار کیا تھی؟

فضائیں کوئی مرثیہ پڑھ رہی تھیں
یہ بستی ہماری عزادار کیا تھی؟

سرِ موسمِ گل شرارے کھلے تھے
خزاؤں کی ٹہنی ثمر بار کیا تھی؟

شعورِ سخن حرف میں کھل رہا تھا
قبائے غزل میری شہکار کیا تھی؟

خدا نے کفِ پا میں جنت عطا کی
مری ماں محبت کا مینار کیا تھی؟

مجھے منزلوں نے پکارا تھا ہمدم
جنوں کیا مرا؟ میری رفتار کیا تھی؟

☆

دیا جلا کے زمانے میں روشنی چاہیں
ہوا کے ہاتھ سے تھوڑی سی زندگی چاہیں

سرائے میر سے نکلیں تو فیض تک پہنچیں
صدائے موجِ غزل میں وہ شاعری چاہیں

حقیقتوں کا فسانہ ہے اور ہی لیکن
ہم اپنے خواب کی جھیلوں میں جل پری چاہیں

ہمارے خواب کی لیلیٰ کوئی نہیں ہے مگر
وفا کے دشت میں مجنوں کی ہمرہی چاہیں

خرد قبول ہے لیکن تری اسیری میں
جنوں کے ساز پہ رقصِ قلندری چاہیں

یہ میرے عہد کے بچے بھی ڈگریاں لے کر
عدو سے جنگ کی خاطر سپہ گری چاہیں

یہی نہیں کہ جلا دی ہیں کشتیاں اپنی
ہم اپنا عزم بھی لیکن سمندری چاہیں

ہم اپنے حال سے واقف بھی رہ نہیں سکتے
پرانے دور سے کیا تزکِ بابری چاہیں

بجھا رہے ہیں چراغوں کو ایک اک کر کے
یہ کون لوگ مرے گھر میں تیرگی چاہیں

☆

سراب زاد فضاؤں میں آگہی چاہیں
فریبِ چشم تماشا سے روشنی چاہیں

سماعتوں کی ضرورت ہے پیار کی آواز
محبتوں بھرے لہجے کی چاشنی چاہیں

منافقت کا وتیرہ ہے یار لوگوں کا
نہ دوستی کو نبھائیں نہ دشمنی چاہیں

بدل گئے ہیں ٹھکانے تمام لوگ مگر
پرانے گھر کے محلے کی وہ گلی چاہیں

آدھا سفر

دعا کرو کہ یہ تعبیر سبز ہو جائے
ہم اپنے خواب کی کھیتی ہری بھری چاہیں

یہ کس نگر کے پرندے چمن میں اترے ہیں
جو ارضِ موجۂ گل کی کلی کلی چاہیں

میں گرم جون کے موسم کا حال نظم کروں
وہ گزرے سرد دسمبر کی ڈائری چاہیں

کسی حسین سے موسم کی خوش لباسی ہو
نہ سادگی سے ملیں ہم نہ سادگی چاہیں

دل و دماغ پہ چھایا ہے قربتوں کا نشہ
نہال ہو کے محبت میں بے خودی چاہیں

میں جاگتی ہوئی راتوں کا خواب ہوں ہمدم
مگر یہ لوگ اجالے میں ہمدمی چاہیں

☆

موجِ خیال و خواب کے گرداب دیکھنا
پھر اس کے بعد دل ہوا غرقاب دیکھنا

کیا روشنی تھی جو مرے آنگن میں چھا گئی
دیوار و در ہوئے مرے خوش تاب دیکھنا

بے بال و پر وجود کی پہلی اڑان ہے
اڑنے لگوں تو پر مرے سرخاب دیکھنا

پھیلیں کہاں تلک مری شاخیں ہری بھری
کھیتی مرے وجود کی شاداب دیکھنا

پہلے ذرا سا دیکھنے والوں کو دیکھ لے!
ہو دیکھنا تو دیکھنے کی تاب دیکھنا

بیچے ہے زندگی کا بدن کاٹ کاٹ کر
بیٹھا ہے ہر دکان پہ قصاب دیکھنا

یہ تو بس ایک نقش ہے خوشیوں کی دید کا
ورنہ ہلالِ عید کیا ؟ مہتاب دیکھنا

کہتا ہے کون رخ مرا دریا بدل گیا
بارش کے بعد شہر میں سیلاب دیکھنا

دہشت پسند شہر میں جینا محال ہے
ہر دل کی داستان ہے خوں ناب دیکھنا

خوابوں کی موج موج ہے آنکھوں کی جھیل میں
ان پانیوں میں گوہرِ نایاب دیکھنا

کیا المیہ ہے آج بھی قحط الرجال میں
رستم کو ڈھونڈنا کبھی سہراب دیکھنا

پہلے مری نمود کا چشمہ بحال کر
پھر سرزمین دل مری سیراب دیکھنا

شاید ہمارے ضبط کا موسم گزر گیا
طوفاں میں ٹوٹتے ہوئے اعصاب دیکھنا

ریشم کے ہر لباس میں وہ خوب رو دِکھے
اک جل پری کے واسطے کم خواب دیکھنا

ہمدم فراز رنگ سے موجِ غزل سجا!
پھر اس کے بعد حلقۂ ارباب دیکھنا

☆

تعبیر کے وجود کو بے خواب دیکھنا
آئینہء جمال کو بے تاب دیکھنا

کیا سانحہ ہوا؟ مرے بس میں نہیں رہا
دریا کے خشک پیٹ کو بے آب دیکھنا

کچھ تو مرے وجود کو تعبیر نذر کر
ہاں دیکھ! دل کی آنکھ سے، بے خواب! دیکھ! نا!

ایسا نہ ہو کہ دید کا منظر چھلک پڑے
جب دیکھنا تو آئنہ خوش آب دیکھنا

آدھا سفر

کتنے قریب آ کے تجھے دیکھتا ہے چاند
ڈھلنے لگے جو شام تو تالاب دیکھنا

ڈسنے لگے ضمیر تو تریاق تک نہیں
گھلنے لگا ہے زہر میں تیزاب دیکھنا

تیرے سوا ہے کون کہ دل ہے لگا ہوا
ہیں زندگی کے کون سے اسباب دیکھنا

پانچوں اکائیوں کو ملا کر بڑھے چلو
خوابوں کی سرزمین ہے پنجاب دیکھنا

فرعون کے دیار میں موسیٰؑ کی دیر ہے
اوندھے پڑے ہوئے سبھی کذّاب دیکھنا

لہجے کی اونچ نیچ معانی بدل نہ دے
احساس کے حروف پہ اعراب دیکھنا

آنکھیں دیارِ خواب کے گنبد میں جھک گئیں
خواہش کے آسمان کی محراب دیکھنا

جس کی اخیر سطر میں کردار مر گئے
اس داستانِ ہجر کا ہر باب دیکھنا

بے حس لباس ہے مرے جلتے وجود پر
سورج کی تیز دھوپ میں برفاب دیکھنا

تعبیر کے وجود کا سایہ نہ پا سکے
دل کی یہ آرزو ہی رہی ، خواب دیکھنا

میں نے کسی شریک کو سجدہ نہیں کیا
میری جبیں نہ دیکھنا ، محراب دیکھنا

ایسا نہ ہو وفا بھی نہ بے کار مشق ہو
ہمدم دیارِ عشق کے آداب دیکھنا

☆

تیرگی میں دیا دیا بھیجا
نور بانٹا ذرا ذرا بھیجا

جانتا تھا وہ آدمیت کو
اس نے سب کو جدا جدا بھیجا

میں نے چھوڑا نہ شہرِ موجہء دل
لاکھ اس نے بلا بلا بھیجا

موجہء گل میں صاحبِ گل نے
رنگ نکھرا کھلا کھلا بھیجا

اس نے مانگی تھی زندگی شاید
ہم نے دل کو اٹھا اٹھا بھیجا

کس نے توڑا ہے پیار کا رشتہ؟
کس نے قاصد خفا خفا بھیجا؟

ہم نے لہجے کی تازگی کے ساتھ
نرم جھونکا صبا صبا بھیجا

پیکرِ شعر نے برائے غزل
حرفِ تازہ ہرا ہرا بھیجا

تن کی دنیا سے من کی دنیا میں
خود کو سب سے چھپا چھپا بھیجا

کس نے ہجرت دوام کرتے ہوئے
دردِ ہجراں نیا نیا بھیجا

فون پر ہی تمام بات ہوئی
اس نے جو کچھ سنا، سنا بھیجا

ٹشو پیپر میں جذب ہو جیسے
اشک کوئی مٹا مٹا بھیجا

خون دے کر کمانے والوں نے
پیسہ پیسہ بچا بچا بھیجا

آنکھ ٹھہری ہے بادلوں کے بیچ
اب کے ساون گھٹا گھٹا بھیجا

مجھ کو اپنی تلاش تھی ہمدم
میں نے خود کو جگہ جگہ بھیجا

☆

دل کی دنیا سے ماورا بھیجا
اس نے خوابوں کا آئنہ بھیجا

ہم نے مانگی تھی پیار کی صورت
اس نے کاغذ پہ دل بنا بھیجا

خود کو بھیجا ہے سامنے اس کے
اور خود میں اسے پڑا بھیجا

جانتا ہوں مگر کنارے نے
دل کی کشتی میں ناخدا بھیجا

خود پہ میرا ہی بس نہیں چلتا
کنجِ ہستی میں نارسا بھیجا

اس نے تازہ ہوا کے لہجے میں
اپنا لہجہ کھلا ہوا بھیجا

زہر پینے لگا تھا میں لیکن
اس نے جینے کا ذائقہ بھیجا

بے خودی میں خودی کے پیکر نے
اپنی ہستی سے آشنا بھیجا

سب کو بھیجا جدا جدا لیکن
ایک ہستی کو ماسوا بھیجا

زندگی کو سہار سکتا ہے
جس نے پانی کا بلبلہ بھیجا

چاک دامن پہ یہ مروت کی
بے لباسی میں بوریا بھیجا

دل کی سنتا ہے اور کچھ بھی نہیں
کیسی بستی میں سر پھرا بھیجا

خط کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟
جانتا ہوں کہ جو لکھا بھیجا

کاروبارِ حیات میں رب نے
کوئی کھوٹا، کوئی کھرا بھیجا

چل پڑا ہوں حسین رستے پر
کس نے یادوں کا قافلہ بھیجا؟

جان کر یہ کہ نامکمل ہوں
رنگ بھرنے کو دائرہ بھیجا

لامکانی سے خاک دانی میں
میرے خالق نے کیا سے کیا بھیجا؟

ڈوبتی ہے چناب میں سوہنی
ہائے ! ماہی نے کیا گھڑا بھیجا

خواہشوں کے مزار پر ہمدم
ہم نے دل کو بجھا بجھا بھیجا

☆

حضرت میر کا دروازہ کھلا چاہتا ہے
بس ذرا دیر ہے اک شعر ہوا چاہتا ہے

میں ہوں انسان مجھے بننا سنورنا ہوگا
مجھ کو معلوم ہے کیا میرا خدا چاہتا ہے

چھوڑ دیتا ہے سلگتا ہوا سورج لیکن
شام ہوتے ہی فصیلوں پہ دیا چاہتا ہے

اور بھی لوگ ہیں آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں
دل مگر تجھ کو زمانے سے جدا چاہتا ہے

کام اوروں کے جو آئے نہ وہ انساں کیسا؟
آدمی وہ ہے جو انساں کا بھلا چاہتا ہے

لامکانی کا مسافر ہے جنوں میں دل بھی
خاک دانی سے کہیں دور خلا چاہتا ہے

ہم تو پہلے ہی مقدر کے ستائے ہوئے ہیں
گردشِ وقت میں کیا دستِ قضا چاہتا ہے

دل کے سودے میں خسارا نہیں دیکھا جاتا
عشق تو جان کی بازی کا جوا چاہتا ہے

چاہتا ہے کہ وہی دشتِ بلا ہو پھر سے
کرب کا دور وہی رسمِ عزا چاہتا ہے

یوں تڑپنے سے تو بہتر ہے کہ موت آجائے
میرا قاتل بھی مرے حق میں دعا چاہتا ہے

کتنی مشکل سے جلایا تھا لہو سے لیکن
یہ دیا پھر سے زمانے کی ہوا چاہتا ہے

میرے جیسے نہ تجھے یار ملیں گے ہمدم
کون دنیا میں تجھے میرے سوا چاہتا ہے

☆

پیش منظر ہے جو ادراک میں کیا چاہتا ہے
دشت آنکھوں میں سمندر کا پتا چاہتا ہے

پھر سے ملتے ہیں سرِ دشت کسی مجنوں سے
آئیے پھر سے شروع عشق ہوا چاہتا ہے

مجھ کو فردا کے اندھیروں کو مٹانا ہے مگر
حال میرا مرے ماضی کی ضیا چاہتا ہے

غنچۂ گل پہ خزاؤں نے اَمَس ڈالی ہے
بے نمودی ہے سو دل تازہ ہوا چاہتا ہے

دل سے کرتا ہے وہ محسوس دلوں کی حالت
چارہ گر اپنے ہی زخموں کی دوا چاہتا ہے

شہر ادراک سے نکلوں بھی تو کیسے نکلوں؟
عرصۂ خواب وہی بند قبا چاہتا ہے

بات سمجھی ہے فسانے میں اگر جو تو نے
ریزہ ءحرف میں کیا اور لکھا چاہتا ہے

اس نے عبرت کی نشانی نہیں دیکھی شاید
کوئی فرعون وہی دستِ عصا چاہتا ہے

آستیں میں نے الٹ دی ہے تو اب ایسا ہے
میرا دشمن مرے سینے میں چھپا چاہتا ہے

دھوپ نگری میں بھی تنہائی کا عالم ہے یہاں
میرا سایہ بھی برابر سے اٹھا چاہتا ہے

کوئی کردار حقیقت سے گریزاں ہو کر
آئنہ زاد فسانے میں بسا چاہتا ہے

گھر سے آنگن کو بھی تفریق کیا تھا جس نے
اک بٹا دو کو بھی تقسیم کیا چاہتا ہے

موجِ ادراک سے ملنے کی گھڑی ہے ہمدم
بند آنکھوں پہ کوئی راز کھلا چاہتا ہے

☆

پیش منظر چھپ گیا، عہد گماں پیدا ہوا
آئنے کے سامنے کیسا جہاں پیدا ہوا

شاد ہوں خواجہ سرا، بونا قدوں کی خیر ہو
لو ! امیر شہر کے گھر حکمراں پیدا ہوا

ظلمتِ شب نے دھندلکے میں سحر آباد کی
کیوں دیے بجھنے لگے ، کیسے دھواں پیدا ہوا

بڑھ گئی اوقات میری بھی در و دیوار میں
پتھروں میں جب وہ سنگِ آستاں پیدا ہوا

ہم صدائے کن سے اٹھے اور مجسم ہو گئے
لامکانی میں ہمارا خاک داں پیدا ہوا

حضرتِ انسان پر ساری کہانی ختم ہے
ایک ہی کردار زیبِ داستاں پیدا ہوا

جان سے گزرے کئی مجنوں وفا کے موڑ پر
عشق کے میدان میں پھر ناتواں پیدا ہوا

حسنِ لامحدود کی وسعت کسے معلوم ہے؟
سات دریاؤں سے بحرِ بے کراں پیدا ہوا

لاج رکھی ہے مرے دل نے دیارِ ہجر میں
میرے پہلو میں کوئی تو مہرباں پیدا ہوا

چل رہا تھا موجۂ صرصر میں لالہ زار پر
یہ بگولا راستے میں ناگہاں پیدا ہوا

آدھا سفر

بڑھ گیا ہے حوصلہ خود کو بھنور میں دیکھ کر
تند موجوں کے مقابل بادباں پیدا ہوا

آنکھ سورج سے ملا کر چھاؤں میں رکھا مجھے
دھوپ نگری میں عجب اک سائباں پیدا ہوا

ہم کناروں کے مسافر سوچتے ہی رہ گئے
دوریوں کا سلسلہ جب درمیاں پیدا ہوا

ایک کتے پر کسی انسان نے کیا بات کی
ہر طرف ہنگامہء شورِ سگاں پیدا ہوا

ایک تم ہی تو نہیں وارد ہوئے اس شہر میں
آج کے دن تو فلاں ابن فلاں پیدا ہوا

دائرہ بڑھتا گیا انسان کی تعمیر کا
وسعتِ املاک سے شہرِ کلاں پیدا ہوا

ہم ستاروں کا سفر کرتے گئے بڑھتے گئے
دشت کی آوارگی میں آسماں پیدا ہوا

اب گریباں کو رفو گر کی ضرورت ہی نہیں
چاک دامن سے جنونِ خوں چکاں پیدا ہوا

کھو گئے استاد ناسخ امتدادِ وقت میں
مدتوں کے بعد کوئی قدرداں پیدا ہوا

چند آوازیں اٹھیں ہمدم جہاں تھرّا گیا
اک ہجومِ شہر سے جب کارواں پیدا ہوا

محبت میں وہ سرشاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی دل کی طرف داری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

لگا کر زخم سینے پر مداوا کون کرتا ہے؟
وہی رسمِ عزاداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی صورت، وہی پیکر، وہی کوزہ گری تیری
وہی آئنہ برداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کبھی شہرِ محبت سے رہائی مل نہیں سکتی
وفا کی چار دیواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

زباں پائی نہیں ٹوٹے ہوئے جذبات نے کیوں کر؟
وہ لفظوں کی اداکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وفا داری بشرط استواری کا وہی وعدہ
وہی شرط وفاداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

فسانہ زندگی بھر کا مری آنکھوں نے لکھا ہے
وہ دیواروں پہ گل کاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کسی کی شوخ آنکھوں میں سنہرا چاند ٹھہرا ہے
ستاروں کی ضیا باری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

سرِ بازار خوشبو کی پزیرائی کا موسم ہے
گلابوں کی خریداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ابھی تک سنگ ہنڈیا کے الاؤ میں ابلتے ہیں
غریبوں کی وہ ترکاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

دیارِ ظلمتِ شب میں یہی میرا سہارا ہیں
چراغوں کی وہ بے داری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

طفیلی حاشیہ بردار آگے بڑھتے جاتے ہیں
ہماری خود انحصاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

دیارِ حسن میں اب بھی قصیدے لکھے جاتے ہیں
غزل میں ناز برداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

بھرم اپنے قبیلے کا ہمیں بھی رکھنا پڑتا ہے
تعلق میں رواداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ابھی بھی شہر میں یوسفؑ کے بھائی کام کرتے ہیں
گھروں میں رسمِ غداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ہمارا ذکر ہوتا ہے ابھی تک آسمانوں میں
کہانی ساتت کرداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی سرسبز آنکھیں ہیں، وہی دشتِ جنوں ہمدم
سرابوں میں شجر کاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

☆

سرِ آئنہ زنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
حقیقت عکس میں ساری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

بھٹکتی پھرتی رہتی ہے وہ سسی خواب زدگی میں
وہ صحراؤں کی بنجاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

چھڑی تھی امن کی خاطر پرائی جنگ بھی لیکن
وہی بارود، بمباری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

گرانی میں بھی اچھا ہے وہ کاروبار کا عالم
ہماری گرم بازاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی بے زار سے دن ہیں وہی بے دار سی راتیں
وہ بے کاری سی بے کاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی کشمیر جلتا ہے ، وہی انگار وادی ہے
چناروں میں وہ چنگاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ابھی تک فکر کی مینا برائے چشمِ ساقی ہے
ہماری مست مے خواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

محبت کھینچ لیتی ہے حسیں جذبوں کی ڈوری سے
دلوں کے بیچ دلداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

بندھی ہے مرد کی عزت کسی بے داغ آنچل سے
یہ عورت یونہی بے چاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

سحر سرسبز ہو کر بھی اجالا زرد لگتا ہے
غموں کی رات اندھیاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہ مجھ کو یاد کرتے ہیں میں ان کو یاد رکھتا ہوں
ہمارے بیچ غم خواری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

زمانے کی وہی چالیں، وہی انسان کے داؤ
عجب ہے یہ جہاں داری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

ثمر آور درختوں کو پنپنے ہی کہاں دے گا؟
عدو کے ہاتھ میں آری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

سجا کر خواب رکھے ہیں خطوں میں اور کتابوں میں
تری یادوں کی الماری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

وہی ہے گردشِ دوراں جہانِ درد میں ہمدم
یہ مزدوری، یہ بے گاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کبھی موجِ سخن ہمدم، کبھی موجِ غزل ہمدم
وہی مشقِ سخن جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

☆

خواب جلتے ہیں تو جلتے ہی چلے جاتے ہیں
ہم چراغوں کا دھواں ہو کے بجھے جاتے ہیں

لامکانی کے پرندے ہیں سو ہجرت کر کے
خاک دانی سے کہیں دور اڑے جاتے ہیں

آگہی خود پہ سرِ دار مسلط کر کے
جنگ لازم ہے سو ہم لوگ لڑے جاتے ہیں

کون سمجھے گا محبت کی روانی سوہنی!
دل کے دریا میں کہاں کچے گھڑے جاتے ہیں

آدھا سفر

کون سنتا ہے بھرے شہر میں ان کی چیخیں
غم کی دیوار میں جب لوگ چنے جاتے ہیں

موجہ ءگل نے سجائی ہیں بہاریں لیکن
زرد موسم ہو تو پتے بھی جھڑے جاتے ہیں

میری آواز کو تم مشق سخن مت کہنا
ایسے اشعار تو بس دل سے کہے جاتے ہیں

کتنے تاروں نے مرے ساتھ مسافت کی ہے؟
کتنے جگنو ہیں جو رستے میں رہے جاتے ہیں؟

کون سورج سے ملائے گا ہماری آنکھیں؟
دھوپ نگری میں تو سائے بھی ڈھلے جاتے ہیں

تم رفو گر ہو فقط شوخ قباؤں کے میاں
چاک دامن یہ کہاں تم سے سیے جاتے ہیں؟

کیسے حالات کی پرکار پہ رکھا مجھ کو؟
میری آنکھوں سے کئی نقش کھنچے جاتے ہیں

کون کہتا ہے یہاں پھول نہیں کھل سکتے؟
ہم جو کھلتے ہیں تو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں

اتنے پیسے تو میں کشکول میں ڈال آتا ہوں
جتنے پیسوں میں یہاں لوگ بکے جاتے ہیں

کس کی آواز کا جادو ہے کہ دنیا چپ ہے
کتنے طوفان ہر اک دل میں اٹھے جاتے ہیں

آؤ ملتے ہیں کسی رشکِ قمر سے ہمدم
آؤ کچھ دیر ستاروں سے پرے جاتے ہیں

سنگ زادے ہیں مگر چور کیے جاتے ہیں
ہم محبت میں بہت دور کیے جاتے ہیں

عشق تیرا ہے جو مصلوب کیے جاتا ہے
ناز تیرے ہیں جو منصور کیے جاتے ہیں

تم سمجھ دار خسارے کو سمجھ سکتے ہو
ہم تو مجبور ہیں ! مجبور کیے جاتے ہیں

کیسا مکتب ہے جو شہرت کا سبق دیتا ہے؟
لوگ کیسے ہیں جو مشہور کیے جاتے ہیں؟

دشت میں قیس کی صحبت کا اثر ہے شاید
عشق کا عین جو منشور کیے جاتے ہیں

کوچۂ جاں میں ترے نام کی خوشبو لے کر
اپنے احساس کو مسرور کیے جاتے ہیں

ساتھ رہتی ہیں مقدر کی لکیریں لیکن
گردشِ وقت سے محصور کیے جاتے ہیں

حبس ایسا ہے کہ سانسیں بھی نہیں چل سکتیں
لوگ جینے سے بھی معذور کیے جاتے ہیں

چاک دامن پہ نہ کشکول پہ جانا لوگو!
ہم گدائی میں بھی معمور کیے جاتے ہیں

تیشہ ء عشق لیے کتنے ہی فرہاد یہاں؟
جبر کے دور میں مزدور کیے جاتے ہیں

پیش منظر ہیں کئی خواب ستارے ہمدم
چشم حیرت سے جو مستور کیے جاتے ہیں

☆

سرابِ چشم تماشائی سے نہیں ملتے
ہم آئنے کی شناسائی سے نہیں ملتے

چمن میں پھول تو کھلتے ہیں بار ہا لیکن
ہم ایسے لالہ ء صحرائی سے نہیں ملتے

قدم قدم پہ پڑے ہیں جو ملگجے کردار
سفید دودھ کی بالائی سے نہیں ملتے

خدا کی خاص عطا ہیں وگرنہ لعل و گہر
کسی زمین ، کسی کھائی سے نہیں ملتے

وہ جن پہ اور ہی بنتا ہے زاویہ دل کا
یہ خدّ و خال تو انگڑائی سے نہیں ملتے

درونِ ذات بصیرت میں پائے جاتے ہیں
حسیں خیال تو بینائی سے نہیں ملتے

حریمِ وقت سکھاتا ہے سب نشیب و فراز
یہ تجربے کسی دانائی سے نہیں ملتے

زمین زاد شجر ہیں یہیں پنپتے ہیں
ہم آسمان کی اونچائی سے نہیں ملتے

ہمارے ذہن پہ صدیوں کا بوجھ رکھا ہے
ہم اپنی پوری توانائی سے نہیں ملتے

سبھی کو روگ لگا ہے انا پرستی کا
یہاں پہ لوگ شکیبائی سے نہیں ملتے

ہمارا عکس رہا ہے مدارِ آئنہ
کسی بھی طور خود آرائی سے نہیں ملتے

بڑے ہوئے ہیں جو بونا قدوں کے جھرمٹ میں
دراز قد کسی اونچائی سے نہیں ملتے

وہی تو جان کے دشمن ہیں، مارے جاتے ہیں
جو روگ تیری پزیرائی سے نہیں ملتے

ملے ہیں سجدہ ء دل میں مقام ایسے بھی
جو سنگِ در پہ جبیں سائی سے نہیں ملتے

ہر ایک دور کے اپنے رہے ہیں رسم و رواج
یہ طور طرزِ علاقائی سے نہیں ملتے

نجانے کون سی مجبوریوں کے قیدی ہیں؟
یہ کیسے بھائی ہیں سگے بھائی سے نہیں ملتے

آدھا سفر

ابھی ہیں دور جزیرے مرے کہ یہ آثار
کنارِ آب جمی کائی سے نہیں ملتے

یہ کون لوگ مرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں
جو میرے خواب کی پرچھائی سے نہیں ملتے

ہر ایک بہن کو ہوتا ہے مان بھائی پر
عجیب لوگ ہیں ماں جائی سے نہیں ملتے

سفیرِ دشتِ محبت بھرے سمندر ہیں
کسی بھی جھیل کی گہرائی سے نہیں ملتے

خوشی کے گیت الگ ہیں، جدا ہے نغمۂ دل
یہ سوز و ساز تو شہنائی سے نہیں ملتے

انھیں میں اچھا کہوں بھی تو کس طرح کہ یہ لوگ
مرے شعور کی رعنائی سے نہیں ملتے

کسی کا پیار ضروری ہے زندگی کے لیے
یہ دام دل کے مسیحائی سے نہیں ملتے

منافقت کا وتیرہ ہے یار لوگوں کا
عدو سے مل کے سگے بھائی سے نہیں ملتے

حسین موجِ غزل کی اٹھان ہے ہمدم
یہ رنگ قافیہ پیمائی سے نہیں ملتے

☆

آئنہ خواب سے آزاد نہ رکھا جائے
اس خرابے کو تو آباد نہ رکھا جائے

جب تلک حوصلہ فولاد نہ رکھا جائے
ہاتھ میں تیشۂ فرہاد نہ رکھا جائے

یاد آتے ہیں تو آتے ہی چلے جاتے ہیں
کیسے لوگوں کو سدا یاد نہ رکھا جائے

کون کہتا ہے بھلا شعر سرِ موجِ غزل
مصرعۂ تر جو طبع زاد نہ رکھا جائے

شاعری دل سے نکلتی ہے ، اثر رکھتی ہے
اس محبت پہ تو نقاد نہ رکھا جائے

سینۂ شب سے نکالیں گے سہانی صبحیں
ان چراغوں کو سرِ باد نہ رکھا جائے

جھیل کا رنگ ہے ، پانی ہے کہ آئنہ ہے
کیسا منظر ہے جسے یاد نہ رکھا جائے

قید کرتا ہے پرندوں کو نشیمن دے کر
نام دشمن کا بھی صیاد نہ رکھا جائے

شہرِ جمہور میں رہنے کا تقاضا یہ ہے
ایک بھی شخص کو ناشاد نہ رکھا جائے

کام ہے دل کا وہی شوق سے کرتا بھی ہے
مکتبِ عشق میں استاد نہ رکھا جائے

دھوپ ایسی ہے کہ سائے کا بدن جلتا ہے
اپنے پیکر کو بھی ہمزاد نہ رکھا جائے

ایسی الجھن میں تو احساس ہی مر جائے گا
خود کو مجموعۂ اضداد نہ رکھا جائے

مجھ کو تاریخ کے اوراق سے ڈر لگتا ہے
میری جاگیر میں بغداد نہ رکھا جائے

حکم ہے شہر میں فرعون کے کارندوں کو
کوئی بھی صاحبِ اولاد نہ رکھا جائے

ایسی مسموم فضائیں ہیں کہ دم گھٹتا ہے
قریۂ حرف میں گل زاد نہ رکھا جائے

کون سنتا ہے یہاں؟ کس کی سنی جاتی ہے؟
شہر میں کوچۂ فریاد نہ رکھا جائے

یہ دبستانِ محبت کا نمائندہ ہے
دل مرا خانۂ برباد نہ رکھا جائے

کون تصویر سرِ شام اتاری جائے؟
کون چہرہ ہے جو شب زاد نہ رکھا جائے؟

کتنے ارمان سرِ ہجر مٹے جاتے ہیں
کتنے خوابوں کو سحر زاد نہ رکھا جائے

آؤ دنیا میں کوئی نقش امر کرتے ہیں
عین ممکن ہے ہمیں یاد نہ رکھا جائے

میں نے مٹی سے بنایا ہے محبت کا بت
وہ زمیں زاد فلک زاد نہ رکھا جائے

مالکِ کن فیکوں پہ یقیں رکھتا ہوں
میرے بارے کوئی الحاد نہ رکھا جائے

میں کہانی میں ترے ساتھ کھڑا سجتا ہوں
میرا کردار ترے بعد نہ رکھا جائے

سلسلہ کچھ تو ملاقات کا بنتا ہے جی!
خواہش دید کو بے داد نہ رکھا جائے

بے یقینی کی فضاؤں کو بدلنا بھی ہے
دل میں اندیشۂ افتاد نہ رکھا جائے

آج پھر عہد نیا ظلِّ الٰہی دیں گے
آج ہنگامۂ افراد نہ رکھا جائے

ٹھہر سکتا ہے کہاں پختہ مکاں بھی ہمدم
ریت بجری میں جو فولاد نہ رکھا جائے

☆

لے کر چلے تھے روشنی ہم بھی جلا کے ہاتھ
کتنے چراغ لگ گئے موجِ ہوا کے ہاتھ

ہم کو وہیں پہ کوزہ گری کا جنوں رہا
کٹتے تھے جس دیار میں ہر پارسا کے ہاتھ

کشتی ہماری اور بھی طوفاں کی زد میں ہے
جب سے لگے ہوئے ہیں کسی ناخدا کے ہاتھ

اِس کارِ ناگہاں میں خسارہ ضرور ہے
لگتا نہیں ہے عشق بھی اکثر وفا کے ہاتھ

سائے پہ اعتبار کا موسم نہیں رہا
آسیب ہیں کہ شہر پہ موجِ بلا کے ہاتھ

مہلت بڑی قلیل ہے کچھ کام کر چلیں
کس کو خبر ہے؟ کب لگے اپنی قضا کے ہاتھ؟

اونچا ہے سر حسینؓ کا دنیا میں آج بھی
پہنچے نہیں ہیں بام کو کرب و بلا کے ہاتھ

دستک ہوئے بغیر بھی محسوس کر لیے
دل پر ترے وجود سے مہکی صدا کے ہاتھ

دینا تھا جن کا کام وہ دیتے چلے گئے
خالی رہے نہیں کبھی اہلِ سخا کے ہاتھ

شہرِ خزاں نژاد کا موسم بدل گیا
خوشبو اڑا کے لائے ہیں تازہ ہوا کے ہاتھ

اک معرکہ بپا ہے یقیں اور گماں میں
بھاری پڑیں گے جھوٹ پہ حرفِ دعا کے ہاتھ

پھینکی تھی گندگی کبھی کوڑے کے ڈھیر پر
نالی سے گھر میں آ گئے کیسے وبا کے ہاتھ

مہکے ہر ایک پھول پہ تتلی کے رنگ میں
نٹ کھٹ سی ایک بیل ہی آئے پیا کے ہاتھ

پانی کی داستان پہ حیرت ہے آج بھی
دریائے نیل آ گیا کیسے عصا کے ہاتھ؟

ہم نے جنوں کے نام پہ ہستی دوام کی
اٹھتے نہیں ہیں عشق میں خود پر انا کے ہاتھ

چلتے ہیں خود کو گردشِ دوراں کیے ہوئے
رکھا ہے زندگی کو بھی صبح و مسا کے ہاتھ

چھیڑا ہے کس نے پیار سے دل کے رباب کو
دھڑکن کا انگ انگ ہے نغمہ سرا کے ہاتھ

دنیا کے حادثات کا ڈر ہے نہ خوف ہے
جب تک ہمارے سر پہ ہیں مشکل کشا کے ہاتھ

چاہا جسے بھی چاک پہ ویسا بنا دیا
کوزہ گری میں طاق تھے اس بے وفا کے ہاتھ

بارش کی بوند بوند نے جل تھل کیا مجھے
کھل کر ملے ہیں آج وہ کالی گھٹا کے ہاتھ

جس نے بڑے ہی چاؤ سے چائے پلائی تھی
بھولے نہیں ہیں آج بھی اس دل ربا کے ہاتھ

مدت کے بعد چین سے سویا میں رات بھر
ماتھے پہ دیر تک جو رہے مامتا کے ہاتھ

میں کھیل میں رہا تو مرے وار دیکھنا
دیکھے ہیں اس جہاں نے ابھی ابتدا کے ہاتھ

جنگل نگل رہا تھا ہمیں حبس کے دنوں
آندھی چلی تو لگ گئے ہم اژدہا کے ہاتھ

تھوڑا سا اختیار ہے لوگوں کے ہاتھ میں
قسمت سنوارتے ہیں کسی ماسوا کے ہاتھ

ہمدم خرد سے کوئی علاقہ نہیں رہا
جب سے لگے ہیں عشق میں دشتِ رسا کے ہاتھ

☆

سرِ آئنہ کوئی زاویہ مرا آشکار کہاں رہا؟
مرے سامنے جو سراب تھا مجھے سازگار کہاں رہا؟

کسی آگہی کے حصار میں، نہ سرور میں، نہ قرار میں
مری زندگی ترے پاس تھی مجھے اختیار کہاں رہا؟

مرے خدّ و خال کا دائرہ تری اک نظر سے بدل گیا
مرے کوزہ گر! ترے سامنے مرا شاہکار کہاں رہا؟

وہ محلے بھر کی سہیلیاں ہوئیں ایک گھر میں جواں مگر
وہ نظر کی شرم کہاں رہی؟ وہ دلوں میں پیار کہاں رہا؟

نہ وہ در رہا، نہ وہ گھر رہا، نہ گلی رہی نہ وہ بام ہے
جو اجڑ گئے ترے ہجر میں انہیں انتظار کہاں رہا؟

نہ محبتوں کی روایتیں، نہ وہ عزتیں، نہ سخاوتیں
وہ نیاز مند کہاں رہے ہیں؟ وہ انکسار کہاں رہا؟

جو سراب چشم کشا کیے ہوئے آ گئے درِ باد پر
وہ دیے ہوا نے بجھائے تو کوئی خواب دار کہاں رہا؟

مری داستان کا عرق تھا، تجھے انتساب جو میں کیا
سرِ حرف میں جو کہا کبھی، مرا حرف زار کہاں رہا؟

نہ تری حدود میں رہ سکا، نہ مری نمود میں آ سکا
جو ترے وجود سے دور تھا وہ مرا مدار کہاں رہا؟

نہ وہ عمر ہے، نہ جنون ہے، نہ وہ باغ ہے، نہ وہ پھول ہیں
وہ جو بے قرار سا دور تھا کبھی برقرار کہاں رہا؟

وہی ریگ زار مسافتیں، وہی ریت جیسے ہیں راستے
ترے میرے بیچ یہ سلسلہ کبھی پائدار کہاں رہا؟

وہی سر بلند رہا یہاں جو نہ دار پر کبھی جھک سکا
جو انا کے شہر میں سر اٹھا کبھی تاجدار کہاں رہا؟

وہی لامکاں کا حسین ہے، جسے خاک داں کی زمین ہے
وہ جو خاک زاد ہوا نہیں کہیں بے کنار کہاں رہا؟

کسی آرزو کے چنار تھے، جنہیں چومنے کے جنون میں
کوئی برف زاد کہاں رہا؟ کوئی کوہسار کہاں رہا؟

وہ عجیب تیرہ شبی رہی ہے امیر شہر کے ہاتھ میں
کہ چراغ تھے تو گنے چنے پہ انہیں شمار کہاں رہا؟

کہاں تاب تھی کہ میں روشنی کی کرن کرن کو سمیٹ لوں
جو چراغ تھا مرے سامنے وہ نظر کے پار کہاں رہا؟

اسے کیا خبر کہ روش روش اسے کس جہاں کی تلاش تھی؟
جسے ہجرتوں نے گنوا دیا وہی شہر یار کہاں رہا؟

رہی ہمدمِ رہِ زندگی ، وہی بے کلی ، وہی بے خودی
تری دسترس ہی رہی مجھے ، ترا انتظار کہاں رہا؟

☆

صدیوں کے آئنے میں فسانہ نشیں رہے
ہم لوگ جدتوں میں روایت امیں رہے

خوابوں کے راستے پہ گماں سے گزر گئے
تعبیر کے شعور میں عین الیقیں رہے

اک اور آسمان پہ اگلا قدم پڑے
پائے رسا کے سامنے دل کی زمیں رہے

دشتِ وفا میں کوئی بھی آگے نہ بڑھ سکا
اہلِ جنوں بھی قیس کے زیرِ نگیں رہے

ایسا کروں کہ خود کو اٹھا کر میں بھاگ لوں
خواہش کے آسمان کی دنیا یہیں رہے

سورج نے مجھ سے رات کی بینائی چھین لی
دیکھا تو شہرِ خواب کے منظر نہیں رہے

الجھے ہیں بار بار یوں خود کو سنوار کر
آئینۂ خیال میں ہم نکتہ چیں رہے

ہر حرف کو مزاج مطابق برت سکوں
ایسی فضائے فکر ہی میرے قریں رہے

ورنہ یہ داستان قیامت سے کم نہ تھی
کردار آدمی کے یہاں بہتریں رہے

لہجے پڑھے ہیں، موجۂ گل کی صدا سنی
حرفِ گل مراد کے ہم قارئیں رہے

دشمن سے نفرتوں کا بھی موقع نہیں ملا
تھوڑی سی زندگی میں محبت نشیں رہے

مسموم زندگی نے ہمیں مار ہی دیا
جب لوگ دوستی میں سرِ آستیں رہے

جنگل تمام شہر میں ہم نے بدل دیا
پھر یوں ہوا کہ شہر میں گوشہ نشیں رہے

دیکھا نہیں قریب سے اپنے جہان کو
ہمدم زمین زاد بڑے دور بیں رہے

☆

شہرِ خیال و خواب میں دل کا مکیں رہے
جی چاہتا ہے اب کوئی پہلو نشیں رہے

ہر لفظ کے مزاج کا اپنا شعور تھا
موجِ غزل میں حرفِ سخن آفریں رہے

پھر یوں ہوا کہ الٹی ہواؤں نے آ لیا
پہلے جو چل پڑے تھے وہی آخریں رہے

میں تھا کہ جس کو شہر کی گلیاں عزیز تھیں
میں تھا کہ رہ گزار جسے جاں گزیں رہے

آدھا سفر

آنکھوں سے اضطراب کے لمحوں کو چوم لوں
ہونٹوں کے سامنے وہی لوحِ جبیں رہے

ہم ایک دائرے کے مماثل رداس تھے
قوسیں ملیں جہاں جہاں، ہم بھی وہیں رہے

دیکھے تو پور پور میں وارفتگی رہی
ہائے وہ نین ساقیا! جو شرمگیں رہے

جی چاہتا ہے اور بھی کچھ اور بھی ملے
یہ کاروانِ شوق بھی ہجرت گزیں رہے

منزل کو چھوڑنے کا سفر میں نہیں کیا
کچھ لوگ میرے سنگ دم واپسیں رہے

ہم پر نگاہِ عشق بھی جادو نہ کر سکی
ہم بھی دیارِ حسن میں کب نازنیں رہے

ہم نے کلی کلی سے چمن کو سجا رکھا
سرو و سمن رہے کبھی ہم یاسمیں رہے

لفظوں کے جام، فکر کی مینا کا دور تھا
حرفِ جنوں میں ذائقے مے آتشیں رہے

ہجرت شعار وقت نے ان کو بدل دیا
جو لوگ زندگی کے قریب و قریں رہے

ہمدم کہی نہیں ہے پہ اچھی غزل سنی
ذوقِ ادب میں برسرِ دل سامعیں رہے

ملگجی سی صورتیں، خواب خواب کی طرح
آئنے کے سامنے ہیں سراب کی طرح

وقت جو ملا ہمیں، سبز ہو، ہرا رہے
عمر چاہیے ہمیں، ہاں شباب کی طرح

حل نہ ہو سکا کبھی، بات اور دلیل سے
مسئلہ ہے زندگی کس حساب کی طرح؟

بار ہا پڑھا گیا، کیوں سمجھ نہ آ سکا
عشق کا نصاب ہے کس نصاب کی طرح؟

امن کی تلاش ہے، وحشتیں ہی وحشتیں
ڈھونڈتا ہے فاختہ، دل عقاب کی طرح

ہجر بھی ، وصال بھی ، دور بھی ، قریب بھی
دو دلوں میں فاصلہ ہے چناب کی طرح

نرگسی وجود میں درد ہے فشار ہے
خود فریب زندگی ہے عذاب کی طرح

حبس ہے کہ جبر ہے سانس کے حصار میں
کھنچ رہی ہے زندگی کیوں طناب کی طرح

دل نے چشمِ ناز کی گفتگو سمیٹ لی
مسکرا اٹھی نظر یوں خطاب کی طرح

مختصر محبتیں ، دیرپا کیسے رکھو
ہر گھڑی کا دوش ہے، اک حباب کی طرح

عصر پھر عطا کرے آفتاب لوٹ کر
آسماں نصیب ہو بو تراب کی طرح

کون ہے جو عشق میں ، جان سے گزر سکے
کون ہے جو چل سکے، آں جناب کی طرح

پتھروں کے دور میں رہ رہا ہے آدمی
ہے امیر شہر ہی خود مآب کی طرح

اک دیے کی زندگی ہے مرا چراغ بھی
روشنی گزار ہوں آفتاب کی طرح

گلبنوں کی داستاں چھیڑ دی بہار نے
دل مہک اٹھا پھر گلاب کی طرح

پیش لفظ ہے ترا ہر نئی کتاب میں
تجھ کو لکھ دیا گیا انتساب کی طرح

زندگی کی لہر سے شاعری کشید کی
موج میں غزل رہی اکتساب کی طرح

ہاں ترے وجود نے اس طرح نمود کی
بودگی رواں رہی انقلاب کی طرح

یوں تو اور لوگ بھی ہم سفر رہے مگر
ایک ساتھ ہم رہے دستیاب کی طرح

روح سے وجود تک، موت کی حدود تک
زندگی کھلی رہی ایک باب کی طرح

انتخاب کیجیے میر کی کتاب سے
یوں سخن وری رہے انتخاب کی طرح

آگہی کے ہاتھ میں تشنگی کے جام تھے
دل انڈیلتا رہا خوں شراب کی طرح

جھیل میں اتاریے ہمدَم خیال بھی
شاعری تو کیجیے ماہتاب کی طرح

مصرعۂ تر دیدۂ نمناک سے بچھڑا ہوا
حرفِ تازہ ہے مرے ادراک سے بچھڑا ہوا

خود فریبی ہے مگر یہ آگہی کا دور ہے
پیش منظر آئنے کی خاک سے بچھڑا ہوا

گرد میں بھی دھجیاں ہیں دامن صد چاک کی
یہ بگولا ہے خس و خاشاک سے بچھڑا ہوا

تند موجوں نے مرے پندار کو توڑا نہیں
میں کنارے آ لگا تیراک سے بچھڑا ہوا

گر گیا آتش فشاں احساس کی ٹھنڈی زمیں
کون جذبہ سینۂ بے باک سے بچھڑا ہوا

خوف طاری ہے ابھی تک گردشِ ایام کا
بھاگتا ہوں کس عدو کی دھاک سے بچھڑا ہوا

دور تک ہے وحشتوں کی تابکاری کا فسوں
یا شرارہ ہے ہماری راکھ سے بچھڑا ہوا

کھینچنی ہیں پھر مقدر کی لکیریں ہاتھ پر
اک ستارہ چاہیے افلاک سے بچھڑا ہوا

ہر گھڑی آزادیوں کی آس میں پلتے ہوئے
دل رہا صیدِ زبوں فتراک سے بچھڑا ہوا

زندگی کہتے ہیں جس کو ایک لمحہ چاہیے
گردشِ ایام کے پیچاک سے بچھڑا ہوا

کون ہمدم کھینچتا ہے سینۂ قرطاس پر
زاویہ اظہار کے ادراک سے بچھڑا ہوا

☆

کس محبت میں زمین پاک سے بچھڑا ہوا
جا بسا پردیس اپنی خاک سے بچھڑا ہوا

کوچۂ جاں سے گزرتا ہے ترے احساس میں
موجۂ گل مرمریں پوشاک سے بچھڑا ہوا

زندگی کی جھیل پر ہے میری ہجرت کا سفر
میں پرندہ چشمۂ افلاک سے بچھڑا ہوا

میں غبارِ دشت ہوں ، میں کیا؟ مری اوقات کیا؟
آسماں پر اڑ رہا ہوں خاک سے بچھڑا ہوا

خواہشوں کے سنگریزے ہیں فقط کھنڈرات میں
میرا ورثہ اور ہے املاک سے بچھڑا ہوا

ذات کے جنگل میں کوئی اور ہی آباد ہے
آدمی ہے شہر کے فتراک سے بچھڑا ہوا

بھوک چھپ سکتی نہیں ہے جھوٹ کے الفاظ میں
لقمۂ اظہار ہے خوراک سے بچھڑا ہوا

رابطے کی تیز رفتاری پہ میں حیران ہوں
اک پرانا خط ملا ہے ڈاک سے بچھڑا ہوا

یہ عزا داری فقط رسمِ سخن داری نہیں
مرثیہ ہے گریۂ غمناک سے بچھڑا ہوا

بے نمودی کا سماں ہے، دل نمو پائے کہاں؟
خشک پتا ہے کوئی امساک سے بچھڑا ہوا

ایک دوجے سے تعلق ہے ہمارا اس طرح
تیسرا پتا ہو جیسے ڈھاک سے بچھڑا ہوا

تھرتھراتی، بھیگتی پلکوں پہ ہمدم پڑھ لیا
ریزۂ ادراک اپنی آنکھ سے بچھڑا ہوا

جنونِ عشق ! یہ سارا کمال تیرا رہا
ترے مرید فقیروں کا حال تیرا رہا

فریبِ چشمِ تماشا میں کھو گیا تھا میں
سرابِ دشت سے آگے کمال تیرا رہا

ترا خیال ہمکتا رہا ہے سینے میں
مرا جنون تھا لیکن ابال تیرا رہا

میں کتنے زہرہ جمالوں کے خواب سے گزرا
اے میری پہلی محبت ! خیال تیرا رہا

او ! کربلا کے اجالے اجاڑنے والے
سرائے شام سے آگے زوال تیرا رہا

کہاں تلاش کروں گا میں حسنِ کامل کو
کہا گیا ہے جسے بے مثال تیرا رہا

ملا دیے ہیں محبت کے رنگ مٹی نے
ہمارے حال میں شامل بھی حال تیرا رہا

ترے سرود نے ایسی نمود بخشی ہے
میں خوش خصال رتوں میں نہال تیرا رہا

میں اپنے اشک ملاتا گیا ترے دکھ میں
صبا کے ہاتھ میں بھیگا رومال تیرا رہا

میں حسبِ حال کبھی دل کی بات کہہ نہ سکا
گریز پا مرے ہمدم سوال تیرا رہا

وجود میرا تھا لیکن خیال تیرا رہا
سو آئنے کے مقابل جمال تیرا رہا

اے زندگی اسے پھولوں کے درمیاں رکھ دے
لے آج سے یہ محبت کا تھال تیرا رہا

نجانے کتنی تمنائیں لاشعور میں تھیں
عجب شعور میں خواہش کا جال تیرا رہا

میں جانتا تھا جدائی کا زخم کیسا تھا؟
شبِ فراق بھی مجھ کو ملال تیرا رہا

پون پون مری شاخوں پہ پھول کھلتے رہے
نکھرتا ، جھومتا ، گاتا نہال تیرا رہا

میں جنوری سے دسمبر کا حال کیا پوچھوں؟
ترے بغیر بھی گزرا تو سال تیرا رہا

یہ جان و مال کی پونجی سنبھال کر رکھنا
جوئے میں ہار چکا ہوں ، سو مال تیرا رہا

تو آفتاب کے جیسا کوئی ستارہ نہیں
عروج تیرا رہا ، نے زوال تیرا رہا

مثال ہے وہ زمانے میں جو رہا تیرا
وہ خوش نصیب ہے جس کو وصال تیرا رہا

تجھے ارید کیا میں تو نام ہونے لگا
مرے عروج میں شامل کمال تیرا رہا

ملا نہیں ترے جیسا کوئی مجھے ہمدم
منافقت بھری دنیا میں کال تیرا رہا

پیش منظر ہے مرا خواب نگر دور نہیں
کون سا باب ترے نام سے معمور نہیں

یعنی مجبور تمناؤں نے سچ بول دیا
وقت کا دار تھا یہ مسندِ منصور نہیں

گھول کر ہجر کی تلخی کو پیے جانا ہے
ساغرِ غم ہے کوئی دخترِ انگور نہیں

اے محبت ! میں ترا ساتھ نہیں دے سکتا
مانگ بھرنے کو ابھی خون کا سیندور نہیں

کون کہتا ہے یہاں پھول نہیں کھل سکتے ؟
دشت میں خار اگانا مرا دستور نہیں

دل کی دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا ہے جو
عشق میں چور نہیں، ہجر میں رنجور نہیں

ایک جھونکے سے ابھی صبح میں ڈھل جائے گی
زلفِ جاناں کی سیاہی شب دیجور نہیں

یہ کچوکا بھی ضروری ہے دلوں کے اندر
ہجر کا زخم ہے بھر جائے گا، ناسور نہیں

آج تاریخ کی تقدیر بدلنے کو ہے
کرب کی رات ہے یہ شبِ عاشور نہیں

کون شاہد ہے جسے لوگ نہیں جانتے ہیں
کون گمنام ہے جو شہر میں مشہور نہیں

اس کہانی میں تو لازم ہے کسی کا مرنا
عشق کے باب میں جینا مرا منشور نہیں

دل پہ دستک سے مجھے بے دار بھی کر سکتی ہے
فکر مفلوج ہے لیکن ابھی معذور نہیں

سب انا زاد قبیلے میں پلے ہیں شاید
قلعۂ جاں میں کوئی ہے کہ جو محصور نہیں

کس کی نمناک نگاہوں کو سرِ خواب رکھوں
شہر آشوب میں کوئی بھی تو مسرور نہیں

کتنے طوفان مرے در پہ ٹھہر جاتے ہیں
میں سمجھتا تھا مصیبت سے یہ گھر دور نہیں

بے نمودی میں خزاؤں کو ہرا رکھتے ہیں
ان درختوں پہ بہاروں میں ذرا بور نہیں

تیرے ہونے سے یہ جنت ہے گوارا مجھ کو
میری منزل تری قربت ہے کوئی حور نہیں

کیا میں آزاد ہوں اس شہر خرابی میں میاں؟
اور آسیب مری ذات پہ مامور نہیں؟

عشق سودا ہے جنوں زاد ! فنا ہونے کا
جان دینے سے مکر جاؤں یہ منظور نہیں

فکر بھی گہری مشقت ہے ضیا پاشی کو
کون معمارِ زمانہ ہے جو مزدور نہیں

خون لگتا ہے مشقت کا صلہ پانے میں
یوں ہی مزدور پسینے میں شرابور نہیں

تو جو چاہے تو نمودار بھی ہوسکتا ہے
یہ مرا دل ہے مرے یار کفِ طور نہیں

کن اجالوں کا تماشائی رہا میں ہمدم
ہر طرف آگ بڑھکتی ہے مگر نور نہیں

☆

خواب زدگی میں زمین و آسماں ہے زندگی
ماورائے آئنہ سارا جہاں ہے زندگی

سر جھکانا پڑ رہا ہے خواہشوں کے سامنے
جبہ سائی کے لیے کیا آستاں ہے زندگی

ہم فریبِ زندگی میں اور کچھ کرتے رہے
اور ہی کچھ ہے جو زیبِ داستاں ہے زندگی

روح تک چھلنی ہوئی نفّاق اور کردار سے
شہر کی سڑکوں پہ جیسے خوں چکاں ہے زندگی

آدھا سفر

بھاگتا ہے آدمی جبرِ مسلسل ، دوڑ میں
ہر کسی کے دل پہ جیسے حکمراں ہے زندگی

دور تک پھیلی ہوئی ہیں حیرتیں ہی حیرتیں
ایسا لگتا ہے کہ جیسے ناگہاں ہے زندگی

دل کی ناؤ کا سفر ہے سانس کی پتوار پر
دھڑکنوں کے سامنے موجِ رواں ہے زندگی

وقت کے نقشِ قدم پر ہے مرا ذوقِ جنوں
راستے کی دھول ، گردِ کارواں ہے زندگی

کوزہ ء امروز میں ہنگامہ ء فردا لیے
عمرِ رفتہ اور یادِ رفتگاں ہے زندگی

ہاں سرائے شب سے نکلے گی ہماری صبحِ نو
تیرگی میں روشنی ہے، جاوداں ہے زندگی

ہجر کا سورج پگھلتا ہے ہماری جان پر
دھوپ نگری میں مگر اک سائباں ہے زندگی

در حقیقت سرِّ آدم بندگی کا راز ہے
ہر قدم پر آدمی کا امتحاں ہے زندگی

چار تنکوں سے ہماری بستیاں آباد ہیں
جنگلی پیڑوں پہ جیسے آشیاں ہے زندگی

تھم گئی ہے تیرگی میں شورشِ ہنگام بھی
دور کونے میں کہیں شورِ سگاں ہے زندگی

کب اترتی ہے تھکن ہمدم کسی آغوش میں؟
بے اماں لمحوں میں دل اور جان ماں ہے زندگی

☆

سنا ہے عشق نگر ہے، جنون خانہ ہے
سرائے دشت میں مجنوں کا آستانہ ہے

جھکا ہوا ہے جو کم زور مار کھانے کو
اسی کی پیٹھ پہ طاقت کا تازیانہ ہے

یہ میرے خواب کا منظر ہے آئنے جیسا
سو آئنے کے مقابل مرا فسانہ ہے

سجے ہوئے ہیں گلی میں مرے در و دیوار
مگر شعور کی دنیا درونِ خانہ ہے

یہ چار دن کی خوشی ہے نشاط سازی میں
ہمارے سر پہ جو شادی کا شامیانہ ہے

الگ نہیں ہے کہانی مری کہانی سے
زمانے بھر کا فسانہ مرا فسانہ ہے

یہیں پہ آکے سنورتی ہے زندگی ہمدم
جہانِ درد سے آگے عجیب خانہ ہے

☆

وفا کی دھوپ میں جلتا ہوا پندار جاتا ہے
ہمارے پیڑ کا سایہ پسِ دیوار جاتا ہے

ہماری تیز رفتاری نظر کی تشنگی تک ہے
سرابِ دشت سے آگے سبک رفتار جاتا ہے

جنوں کے دشت میں صاحب! خرد مندی نہیں چلتی
خرابے میں ہمیشہ کوئی واقف کار جاتا ہے

مری کوزہ گری کیا ہے؟ مسلسل خاک ریزی ہے
میں اپنا چاک چھوڑوں تو مرا شہکار جاتا ہے

آدھا سفر

سبک رفتار خبروں پر ہمیں حیرت نہیں ہوتی
ہمارے شہر سے ہوتا ہوا اخبار جاتا ہے

نہیں کی کج ادائی میں نہاں ہے ہاں پسِ پردہ
یونہی انکار بھی کر کے کوئی اقرار جاتا ہے

میں پابندِ سلاسل ہوں مگر زنجیر سے ہو کر
فصیلِ شہر سے آگے مرا انکار جاتا ہے

مرے الجھے ہوئے بستر کی یہ شکنیں بتاتی ہیں
دیارِ خواب سے ہو کر کوئی بے دار جاتا ہے

یہ دنیا کیسی دنیا ہے یہاں دل ہی نہیں لگتا
یہاں پر جو بھی آتا ہے، وہ آخر کار جاتا ہے

میں اپنی جاں ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں دنیا میں
عدو کا وار سینے پر یونہی بے کار جاتا ہے

آدھا سفر

پرائی دھوپ رہتی ہے ہماری سبز دھرتی پر
سنہری فصل کا سونا سمندر پار جاتا ہے

عجب سودا سمایا ہے محبت کے کھلاڑی میں
جوئے میں زندگی بھر کی کمائی ہار جاتا ہے

بقولِ فیض رستے میں اسے منزل نہیں جچتی
نکل کر کوئے جاناں سے جو سوئے دار جاتا ہے

بقدر ظرف ملتا ہے یہاں سے پیار کا سودا
کوئی دو چار ہوتا ہے کوئی لا چار جاتا ہے

ادا چپ ہے، وفا چپ ہے، نظر چپ ہے، خبر چپ ہے
نجانے کس طرف یہ قافلہ سالار جاتا ہے

سخن پرور! غزل خوانی روایت ہے کہ جدت ہے
طرب کی لے پہ کس جانب مرا فنکار جاتا ہے

بھرم رکھنا پڑے گا یوں مجھے اپنے قبیلے کا
مرے سر پر کوئی رکھے ہوئے دستار جاتا ہے

فریبِ آئنہ کرتا نہیں تعبیر منظر کی
ہمارے خواب کا پیکر پسِ زنگار جاتا ہے

پھر اس کے بعد ہفتہ بھر مجھے چھٹی نہیں ملتی
پرانی یاد سے ملنے مرا اتوار جاتا ہے

مرا خاموش رہنا ہی ضروری ہے یہاں ہمدمؔ
جو دل کی بات کہتا ہوں مرا معیار جاتا ہے

☆

کون ہو گا بہم دسمبر میں
تم نہ ہو گے نہ ہم دسمبر میں

کیسی یخ بستگی کا رستہ ہے
جم گئے ہیں قدم دسمبر میں

بارشوں کو ترس رہے ہیں ہم
یا الٰہی ! کرم دسمبر میں

آگہی کے رواں سفر میں ہے
روشنی کا قلم دسمبر میں

المیہ ہے کہ ایک مدت سے
جاگتے ہیں ستم دسمبر میں

سرد لہجوں کا شاخسانہ ہے
ہم پہ آتے ہیں غم دسمبر میں

جنوری میں جو خواب دیکھا تھا
ہے سرِ چشمِ نم دسمبر میں

اک ٹھٹھرتے ہوئے بدن کے ساتھ
کس کا سایہ ہے کم دسمبر میں

سال بھر کی اذیتوں کا غم
ہونے لگتا ہے ضم دسمبر میں

ضبط پر بھی ہے حبس کا عالم
اب تو گھٹتا ہے دم دسمبر میں

سانحہ ہے کہ المیہ اپنا
کیوں برستے ہیں بم دسمبر میں

ہجر زدگی گزار کر ہمدم
کون کھائے قسم دسمبر میں

☆

آئینۂ جہاں ہے مرا خواب جنوری
تازہ رتوں کا ایک نیا باب جنوری

گزری ہوئی ہوائیں بھی بارش بغیر تھیں
اس بار تو لگے گا ہی بے آب جنوری

کتنی کہانیوں میں دسمبر کا روگ ہے
کتنے ہیں پیار و یار کے ابواب جنوری

ہے اس کے بعد الٹے قدم لوٹنا ہمیں
ہے سالِ نو کی آخری محراب جنوری

اب بھی کٹے گا وقت ہمارا زمین پر
ایسا بھی کیا، کہیں تجھے سرخاب جنوری

پچھلے برس کے خواب شکستہ نہیں ہوئے
سرسبز ہے، ہرا بھرا، شاداب جنوری

کچھ تو مرے خلوص کا پندار بھی رہے
آنکھوں میں کتنے خواب ہیں بےتاب جنوری

امید کا دیا ہے نگاہوں کی روشنی
تاریکیوں میں لگتا ہے مہتاب جنوری

یا رب مری نگاہ تلاطم کی خیر ہو
خوابوں کا لے کے آ گیا سیلاب جنوری

تو نے کسی کو اجلا فسانہ نہیں دیا
تجھ کو تو جانتے ہیں نا احباب جنوری

کل تک مری گلی میں پرانے چراغ تھے
اب کے برس جلیں گے مرے خواب جنوری

جو کچھ بھی تھا وہ ہم سے زمانے نے لے لیا
کرنا پڑیں گے جینے کے اسباب جنوری

ظالم رتوں کی تیز چھری دل پہ چل گئی
جینے نہ دے گا مجھ کو یہ قصاب جنوری

کتنے دسمبروں کی شہادت کا قرض ہے
لکھنا پڑے گا مجھ کو نیا باب جنوری

شستہ نوائے عشق کے لفظوں کی بات ہے
پھر سے لگا رہا ہوں میں اعراب جنوری

ٹوٹیں گے خیر یہ بھی ہواؤں کی چوٹ سے
یکجا کیے ہوئے ہیں جو اعصاب جنوری

پردہ مرے وجود کا مہکا رہے یونہی
نیلی رتوں نے پہنا ہے کم خواب جنوری

شاید دلِ تباہ سے کوئی صدا اٹھے
دستِ جنوں سے چھیڑ دیے مضراب جنوری

آنکھیں نہیں لگی ہیں اندھیروں کے خوف سے
اس بار بھی لگا ہے جو بے خواب جنوری

مٹی مرے وجود کی بنجر نہ ہو کبھی
بھر دے مری زمین کے تالاب جنوری

ہمدم نوا سرا کی نمودِ سحر سلام
خوش آمدید! مرحبا! آداب جنوری

☆

عجیب شہر کا رستہ مری نظر میں رہا
سفر تمام ہوا اور میں رہ گزر میں رہا

ہم اپنے عہد سے آگے کی بات کرتے رہے
کسی کا درد تھا لیکن ہمارے سر میں رہا

دلیل ڈھونڈ رہے تھے وکیل بھی گویا
ہمارے بیچ تعلق اگر مگر میں رہا

تری نگاہِ تمازت کے ساتھ دیکھا ہے
وہ ایک شعلہ ء دل جو کبھی شرر میں رہا

آدھا سفر

میں ٹوٹ گرنے لگا تھا کہ ہاتھ آ پہنچے
یہ پیار زیر بھی ہوتے ہوئے زبر میں رہا

گھڑی گھڑی میں بریکنگ نیوز چلتی رہی
فریبِ چشم تماشا خبر خبر میں رہا

یہ رنگ میں کبھی دیکھا تھا آستینوں میں
جو رنگ میرے عدو کی عیاں سپر میں رہا

کسی کی سرد ہنسی تھی ، سمجھ گیا میں بھی
یہ ذائقہ تھا کسی زہر کا شکر میں رہا

منافقت کے لبادے میں جھوٹ تھا لیکن
وہ راہ زن بھی عجب صورتِ خضر میں رہا

اسے نکلتے بھی دیکھا غروب ہوتے بھی
وہ صبح و شام کا سورج جو دوپہر میں رہا

کسی کی موج میں دھمال ڈالتا ہوا دل
غبارِ عشق میں ، مٹی کے بال و پر میں رہا

ترا وجود محبت میں غیر واجب تھا
مرے وجود کا حصہ تری کمر میں رہا

وگرنہ شہر کا لہجہ بدلنے والا تھا
یہ معجزہ ہے کہ جادو مرے ہنر میں رہا

ہر ایک آنکھ پہ بنتا ہے کیا غزل کہنا؟
غرورِ چشمِ غزالاں تو اک نظر میں رہا

کہیں کی آگ تھی لیکن یہاں لگائی گئی
زمانے بھر کا بکھیڑا ہمارے گھر میں رہا

نجانے خواب تھے کتنے مگر ادھورے تھے
تمام رات میں اپنے پرانے گھر میں رہا

آدھا سفر

بدل گئے ہیں زمانے کے خدّ و خال مگر
پرانے عہد کا چہرہ کھنڈر کھنڈر میں رہا

پڑا تھا ایک قدم ہی غلام گردش میں
ہمارا عہد مسلسل اسی ڈگر میں رہا

بس ایک بار پکارا تھا مجھ کو پانی نے
پھر اس کے بعد سمندر مرے بھنور میں رہا

دیارِ شب میں دھندلکے وجود پاتے رہے
چراغ بجھتے گئے اور دھواں سحر میں رہا

کہاں گیا وہ محبت کا سوز و سازِ دروں
مریضِ دل میں رہا ہے نہ چارہ گر میں رہا

جو بچ رہا ہے خزاؤں کے وار سے ہمدَم
مری نمود کا موسم اسی شجر میں رہا

☆

کہتے ہیں جنہیں لوگ مسلمان وغیرہ
رہتے ہیں وہ کس شہر میں انسان وغیرہ

جب آنکھ دریچے کی خموشی پہ رکی ہو
رہتا ہے کہاں خواب کا امکان وغیرہ

جب شعر و سخن غم کا مداوا نہیں کرتے
کس کام کے رہتے ہیں یہ دیوان وغیرہ

تم دل کی تباہی کا سبب پوچھتے کیوں ہو؟
اس راہ میں لٹ جاتے ہیں ایمان وغیرہ

اچھا ہے یہاں حبس کا موسم نہیں رہتا
پیڑوں سے مرا شہر ہے گنجان وغیرہ

احساسِ زیاں ہے کہ ترقی کا سفر ہے
صدیوں نے لیا ہم سے جو تاوان وغیرہ

دریائے محبت ہے جو روکے نہ رکے گا
تھمتا ہے کہاں عشق میں طوفان وغیرہ

کیا اور کوئی جنس گراں ڈھونڈ رہے ہو؟
بکتے ہیں مرے شہر میں انسان وغیرہ

ادراک نہیں جن کو میاں کوزہ گری کا
بنتے ہیں کہاں ان سے سخن دان وغیرہ

قرطاس پہ ہمدمؔ یہ مری موج غزل ہے
کہتے ہیں جسے درد کا عنوان وغیرہ

☆

موجِ غزل ہے، مصرعۂ تر، نوبہار چپ
آنکھوں سے ہم کنار ہوئی بے کنار چپ

خاموشیوں کا رنگ غزل میں اتار کر
آئینۂ سخن کا ہے دار و مدار چپ

ایسا بھی کیا کہ جبر کے قیدی بنیں رہیں
خاموش برقرار نہ ہیں بے قرار چپ

سچ بولنے لگا ہوں، فضاؤں کی خیر ہو
شہرِ جنوں میں توڑ کے میں دل فگار چپ

کیسی خزاں رسیدگی ہم پر سوار ہے
دور خزاں نہیں ہے مگر کیوں بہار چپ

لازم ہے بندگی کا تقاضا نبھا چلیں
بیٹھے ہیں مسجدوں میں محبت گزار چپ

اک دوسرے کو جانتے ہیں اور کیا کہیں
ہم داستاں خموش ہیں اور ہم شعار چپ

شورِ سگاں ہے اور کوئی بولتا نہیں
گویا سخن طراز ہیں سارے گنوار چپ

وہ راگنی چھڑی ہے محبت کے ساز پر
سوزِ دروں کے سامنے ٹھہرے ستار چپ

کچھ اس ادا سے اس کا بناؤ سنگھار تھا
زیور بنا بنا کے ہوئے سب سنار چپ

آدھا سفر

منزل کہاں ملے گی بگولوں کے شہر میں
کب تک رہیں گے راہ میں گرد و غبار چپ

ہنگامہ ء جہاں ہے لبِ بام زندگی
احساس کے دروں ہیں دلوں کے دیار چپ

ہائے ! میں اس ادا پہ تکلم کو وار دوں
اک ان کہا سوال ، جواباً ہزار چپ

صحرا بدن کی خاک میں کیسے اتر گئی؟
نیلے سمندروں کی طرح بے کنار چپ

شی شی ! نہ بولنا یہ دلوں کا دیار ہے
آنکھوں سے بولتی ہے یہاں بار بار چپ

محدود سا ہنر ہے مرے ہم نوائے دل
کیسے سخن کروں گا میں یہ بے مہار چپ

لفظوں کی کیا مجال کہ کچھ گفتگو کریں؟
حسنِ کلام پر ہے مری جاں نثار چپ

یخ بستگی کی لہر ہے ہمدم پون پون
ان برف زادیوں میں ہیں کتنے چنار چپ

☆

دھڑکن سے ہم کلام رہی بار بار چپ
دل میں اتر گئی ہے کٹیلی کٹار چپ

تیری محبتوں کا سزاوار میں نہیں
دریا کے سامنے ہے مری آبشار چپ

یہ آگ، سرد آگ ہے، بجھتی نہیں کبھی
دل میں سلگ رہے ہیں ہزاروں شرار چپ

پندار ہے دلوں کا کہ دیوار ہے کوئی
شیشے سے دکھ رہی ہے ہمیں آر پار چپ

میں ہوں فصیلِ شہر پہ جلتا ہوا دیا
ہجرت کی راہ پر ہے مرا انتظار چپ

اس پر ابھی سے حرف کی حرمت خموش ہے
ٹوٹے گی اب کے بار جو بے اختیار چپ

سب لوگ جانتے ہیں تری ذات کا فسوں
ہر جا بنی ہوئی ہے تری اشتہار چپ

کب تک بھرم رہے گا زمانے کے سامنے
کب تک رہے گی بیچ یونہی برقرار چپ

انگلی اٹھا کہ اس نے کہا ؛ یار چپ رہو!
مشکل یہی رہی کہ رہیں بار بار چپ

یہ چپ کا راستہ ہی ملائے گا پیار میں
دونوں کے درمیاں ہے یہی رازدار چپ

دہشت نے ہر زبان کو پتھر بنا دیا
ایسی فضا میں سب کو رہی سازگار چپ

کس نے مرے چمن کی بہاریں اجاڑ دیں
چھائی ہوئی ہے شہر پہ اک سوگوار چپ

شاید مجھے بھی شہر میں سچ بولنا پڑے
پتھر سے ہو رہی ہے مری سنگسار چپ

کس کج کلاہ شخص نے رسوا کیا ہمیں
لاحق ہوئی ہے شہر کو اک شرمسار چپ

آواز تو اٹھائی ہے، دشمن کا شکریہ!
لیکن ہے دوستوں کی بہت یادگار چپ

ہے برف زاد بے حسی اپنے دیار میں
پربت، پہاڑ، وادیاں، ہیں کوہسار چپ

بولیں گے رنگ، نقش بکھیریں گے شاعری
تصویر کر رہا ہوں تری شاہکار چپ

ہمدم سخن یہ ہے کہ دلوں میں کلام ہو
حسنِ کلام کا ہے مگر اختصار چپ

☆

یہ لوگ جس کو سمجھتے ہیں آشنائی میاں!
یہ آئنے کا تماشا ہے منہ دکھائی میاں!

ہم اپنی طاق نوائی سے ہاتھ دھو بیٹھے
ہماری ذات سے نکلی ہے کیا اکائی میاں!

کسی یزید کی بیعت میں کر نہیں سکتا
مرے شعور کی عادت ہے کربلائی میاں!

دیارِ عشق میں کس کا چراغ جلتا ہے؟
یہاں پہ قیس میاں کی ہے پیشوائی میاں!

دیا جلے گا دیے سے تو روشنی ہو گی
ہوا کرے گی ہماری بھی رہنمائی میاں!

وہ دشمنی بھی نبھانے سے باز آنے لگا
عدو کو مہنگی پڑے گی یہ بے وفائی میاں!

مرے وجود کے اندر حروف بولتے ہیں
یہ کس کتاب کی ہوتی ہے رونمائی میاں!

وگرنہ ہم تو کسی اور ہی جہان کے تھے
کشش زمین کی ہم کو بھی کھینچ لائی میاں!

ہم اک جزیرے پہ رہتے ہوئے نہیں ملتے
ہمارے گرد اگائی گئی ہے کائی میاں!

بس ایک بار ستایا تھا اس کو دنیا نے
پھر اس کے بعد وہ لڑکی نہ مسکرائی میاں!

ہم ہی نے دام بڑھائے تھے آدمی کے یہاں
ہم ہی خراج چکائیں گے پائی پائی میاں!

یہ میرا تیشۂ دل ہے، سو میرے ہونے سے
پہاڑ ہونے لگے ہیں یہاں پہ رائی میاں!

گلوں میں ڈھلنے لگے ہیں یہ لفظ کاغذ پر
لہو کے رنگ سے مہکی ہے روشنائی میاں!

یہ اقتدار کی وحشت ہے یا جنون کوئی
الجھ رہا ہے خرابے میں بھائی بھائی میاں!

سرائے خواب میں کوئی اترنے والا ہے
بچھا کے بیٹھ گیا ہوں میں چارپائی میاں!

کوئی کوئی ہے جو کشتی سنبھال سکتا ہے
کسی کسی کا نصیبا ہے ناخدائی میاں!

نہ مل سکیں گے کبھی تیسرے کنارے پر
ہمیں تو مار ہی ڈالے گی نارسائی میاں!

یہ مے کدہ ہے یہاں پر شراب لازم ہے
ارے! شباب کے ہوتے یہ پارسائی میاں؟

یہاں پہ خار دوبارہ نمود پائیں گے
ازل سے موسم گل بھی ہے ارتقائی میاں!

ہمارے جسم بھی جلتے ہیں دھوپ نگری میں
ہمارے ہجر کا خطہ ہے استوائی میاں!

میں اپنی پہلی محبت سے شعر کہتا ہوں
یہ دل کی بات نہیں ہے سنی سنائی میاں!

میں سوچتا ہوں کہ سب لوگ سوچتے ہیں کیا؟
سبھی کو اپنی پڑی ہے مجھے پرائی میاں!

کھٹک رہا ہے کسی سے وفا نبھانا بھی
مرے خلوص میں خامی ہے یا برائی میاں!

نجانے عشق ہمیں اور کیا دکھائے گا؟
ابھی تو ہجر کا موسم ہے ابتدائی میاں!

قدم قدم پہ بدلتے ہیں کینچلی اپنی
یہ سانپ جیسے عدو ہیں کہ میرے بھائی میاں!

بس ایک نام ہے درخورِ اعتنا ہمدم
غزل میں کس کو میسر ہے میرزائی میاں!

وفا کے دشت میں نکلیں جنوں کی حد کیے جائیں
یہ کون لوگ خرابے میں بے خرد کیے جائیں

اچھل اچھل کے لپٹتے ہیں میرے پاؤں سے
یہ میرے شہر کے بونے دراز قد کیے جائیں

ہمارے بعد زمانے کا حال کیا ہوگا؟
ہم ایسے لوگ جو دنیا میں مسترد کیے جائیں

ہمارا کوزہ گروں سے یہی تقاضا ہے
جہاں کے چاک سے گزرے ہوئے جسد کیے جائیں

ہم اپنے آپ میں خوابوں کو دفن کرتے ہوئے
حدودِ ذات کی مٹی کو ہی لحد کیے جائیں

امیرِ شہر نے ہم کو یہ اذن بخشا ہے
فلاں کو سر پہ بٹھائیں، فلاں کو رد کیے جائیں

سنہرے خواب ہیں پیکر تلاش کرتے ہیں
کسی حسین سے چہرے کے خال و خد کیے جائیں

یہ میرے دوست محبت سے آشنا کر کے
انا کے شہر کی گلیوں سے نابلد کیے جائیں

ہمارا کام عبادت ہے، سو کریں گے ہم
حسد ہے جن کا وتیرہ، وہی حسد کیے جائیں

دیارِ ہجر میں اک پل بھی رہ نہیں سکتا
سو اپنی یادوں سے کہہ دو مری مدد کیے جائیں

اسی لیے تو میں سولی پہ آن پہنچا ہوں
مرے اصول نہ دنیا میں مسترد کیے جائیں

یہی ہے نادِ علی کہ محبتوں کے امیں
دوانے شہر نجف میں علی مدد کیے جائیں

غزل کے رنگ میں غالب سا ریختہ کہہ کر
نوائے میر سخن کو ہی مستند کیے جائیں

یہ زندگی ہے یہاں پر نصیب چلتا ہے
ازل ہے جن کا مقدر وہی ابد کیے جائیں

کوئی کہانی تو انسان پر لکھیں پہلے
پھر اس کے بعد یہ کردار نیک و بد کیے جائیں

ہم اپنے عہد پہ دائر مقدمہ کریں گے
ہمارے سامنے ملزم تو نامزد کیے جائیں

یہ سینہ تان کے نکلے ہیں روشنی کے لیے
ہوا کے سامنے کتنے چراغ رد کیے جائیں

مری نظر کے تراشے ہوئے نظارے ہیں
یہ آئنے کے مناظر مجھے سند کیے جائیں

سنوارا جائے غزل کے حسین مصرعوں کو
محبتوں بھرے اعراب شدّ و مد کیے جائیں

کہاں سے ملتی ہے امداد کچھ ذہنوں کو
یہ میرے دیس کے دشمن ہیں بے رسد کیے جائیں

ہمارے چاک گریباں سے روشنی لے کر
حدودِ ذات سے نکلے ہوئے سند کیے جائیں

وفا، خلوص، محبت میں بندگی ہے میاں
یہ چند کام ضروری ہیں جو اشد کیے جائیں

تمہارا نام سجاتے ہیں جو محبت سے
وہی حروف مکرر سنائیں شد کیے جائیں

یہ طے ہوا ہے چمن پر نثار ہونے کو
قفس گریز پرندے ہی نامزد کیے جائیں

قدم قدم پہ نصیبا طوافِ کعبہ ہو
جدھر جدھر سے بھی گزریں احد احد کیے جائیں

ہمارے ہاتھ میں جادو ہے آشنائی کا
جسے بھی چھو لیں محبت سے مستند کیے جائیں

جو مصلحت کے تقاضے کے تحت لکھے گئے
سو مستقل یہ فسانے نشان زد کیے جائیں

خدا کے بندوں سے ملنا نہیں تو جائیں میاں!
اٹھائیں اپنا مصلّٰی، خودی کی حد کیے جائیں

ہمارے بعد کی نسلیں ہمیں بھی یاد رکھیں
کچھ ایسے کام بھی ہمدم برائے جد کیے جائیں

☆

موجِ ہوا میں آئے ، کئی سال ہو گئے
دل کا دیا جلائے ، کئی سال ہو گئے

یہ کیسی راکھ دل میں سلگتی ہے آج بھی؟
چنگاریاں بجھائے کئی سال ہو گئے

اب تو غمِ حیات سے فرصت نہیں ہمیں
شعروں میں تجھ کو لائے کئی سال ہو گئے

لہجے میں وہ کھنکتی ہوئی ٹھمریاں کہاں؟
دھڑکن پہ گنگنائے کئی سال ہو گئے

آدھا سفر

یہ میرے پیش رو تھے جو رہبر ہیں آج کل
رستہ انہیں دکھائے کئی سال ہو گئے

اماں کی ڈانٹ کھائے ہوئے عمر کٹ گئی
لوری پہ نیند آئے کئی سال ہو گئے

منظر بدل گئے ہیں، وہ کردار اب کہاں؟
اک داستاں بنائے کئی سال ہو گئے

ہنگامہ ء شعور کا احساس تک نہیں
ذہنوں کو سنسنائے کئی سال ہو گئے

دھرتی مرے خیال کی سرسبز ہی رہی
دل میں تجھے بسائے کئی سال ہو گئے

یہ کیا کہ مجھ کو اپنی خبر تک نہیں ملی
خود کو کہیں گنوائے کئی سال ہو گئے

جام و سبو نہیں رہے لیکن خمار ہے
نشے میں ہم کو آئے کئی سال ہو گئے

اب تو مری زمین پہ وہ خاک بھی نہیں
مٹی کا گھر بنائے کئی سال ہو گئے

پڑتے نہیں زمین پہ ہمدم مرے قدم
سر پر فلک اٹھائے کئی سال ہو گئے

☆

پیش منظر میں جو ٹھہرے ہیں نظر کے ساتھی
خواب زادے ہیں مرے شام و سحر کے ساتھی

شاخ کوئی بھی خزاں بار نہ ہونے دیں گے
میرے پالے ہوئے پنچھی ہیں شجر کے ساتھی

حرف قرطاس کے سینے کو رفو کرتے ہیں
زاویے دیکھ ذرا مصرعہ ء تر کے ساتھی

شام ڈھلتے ہی کہیں دور چلے جاتے ہیں
سائے میرے ہیں کسی دھوپ نگر کے ساتھی

آدھا سفر

چھوڑ آئے ہیں فلک زاد فضائیں لیکن
خاک دانی میں رہے خاک بسر کے ساتھی

راستہ اور کوئی ہم سے بنایا نہ گیا
ہم رہے اگلے زمانے کی ڈگر کے ساتھی

آنکھ سورج سے ملاتا ہوں ترے ہوتے ہوئے
میرے ہم زاد! مرے دھوپ نگر کے ساتھی

ہم سفر جتنے مسافر تھے مجھے چھوڑ گئے
کچھ پرندے ہی رہے میرے سفر کے ساتھی

ایک مدت سے ہمیں ڈھال پہ رکھے ہوئے ہیں
سر کٹاتے ہیں کہاں تیغ و سپر کے ساتھی

دھول اڑتی ہے مگر پاؤں اٹھے جاتے ہیں
یہ بگولے ہیں مری راہ گزر کے ساتھی

آدھا سفر

آئنہ ساز فضاؤں میں بھی خوش رہتا ہوں
مل ہی جاتے ہیں ادھر میرے ادھر کے ساتھی

یہ در و بام کبھی میرے ہوا کرتے تھے
اب جنہیں لوگ سمجھتے ہیں کھنڈر کے ساتھی

میں وگرنہ غمِ ہجراں کو بھلا بیٹھا تھا
زخم کچھ اور ہوئے دردِ جگر کے ساتھی

سامنے تیرے کوئی اور کنارہ بھی نہیں
کس طرف چھوڑ کے جائے گا سفر کے ساتھی

اور میں ہوں کہ لگاتار چلا جاتا ہوں
میری رفتار سے جلتے ہیں ٹھہر کے ساتھی

معرکہ آج بھی دنیا کا بدل سکتا ہے
ہم کو مل جائیں جو دو چار بدر کے ساتھی

کب کسی خواب جزیرے پہ اتر سکتے ہیں
موج در موج بھٹکتے ہیں بھنور کے ساتھی

ڈھونڈ لیتے ہیں خرابے میں ٹھکانہ اپنا
کتنے طوفان ہیں ٹوٹے ہوئے گھر کے ساتھی

یہ اجالا تو کسی اور نگر پھیلے گا
یہ ستارے ہیں کسی اور سحر کے ساتھی

مسندِ حرف سنبھالی نہیں جاتی ہمدم
کتنے شاعر ہیں یہاں فکر و ہنر کے ساتھی

☆

کسی نے اسم پڑھا تھا خدا کے لہجے میں
چراغ جلنے لگے تھے ہوا کے لہجے میں

مرے شعور کو میرا غرور مت کہنا!
خودی بیان ہوئی ہے انا کے لہجے میں

کس آسماں سے مرے دل پہ بارشیں اتریں؟
چمک اٹھیں مری آنکھیں گھٹا کے لہجے میں

میں پھر بھی سچ کا لبادہ سمجھ نہیں پایا
وہ جھوٹ بول رہا تھا خطا کے لہجے میں

یہ نفرتوں کا جنم بھی محبتوں پر ہے
وفا کا باب کھلا ہے جفا کے لہجے میں

وگرنہ حرف تو مفہوم ہی نہیں رکھتے
سخن تمام چھپا ہے ادا کے لہجے میں

اندھیر نگری میں ایسا بھی سلسلہ دیکھا
کہ تیرگی بھی پلی ہے ضیا کے لہجے میں

خزاں رتوں میں بہاریں نمود پاتی ہیں
صدائے موجۂ گل ہے فضا کے لہجے میں

میں جا رہا ہوں مگر مستقل نہیں مری ماں!
سو الوداع مجھے کہنا دعا کے لہجے میں

حصارِ عشق سے باہر نکل نہیں سکتا
کسی نے باندھ رکھا ہے وفا کے لہجے میں

حسینیت کا ترانہ بھلا نہیں سکتے
عجیب سوز ملا کربلا کے لہجے میں

یہی کلید ہے دنیا میں کامیابی کی
قرآنِ پاک پڑھو مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لہجے میں

مہک اٹھے مرے پاؤں کے خار بھی ہمدم
گلوں نے جب بھی پکارا صبا کے لہجے میں

☆

لے آؤں اگر شعر میں اوصافِ حمیدہ
انگشت بدنداں ہوں سبھی لوگ چنیدہ

آئنہ ءِ ہستی پہ نظر پڑتی ہے لیکن
یہ چشمِ تماشا ہے بہت خواب رسیدہ

سب لوگ مری موجِ سخن دیکھ رہے ہیں
پڑھتا ہے بھلا کون مرے غم کا جریدہ

احساس تفاخر ہے نہ پندار خودی ہے
رکھی ہے بلندی پہ یونہی ذات خمیدہ

اب اور مری کوزہ گری کون کرے گا؟
اڑتی ہے سرِ چاک مری خاک تپیدہ

کب رونق بازار تھے ہم اپنے وطن میں؟
ہم کو تو زلیخاؤں نے بے مول خریدا

اب کون مرے درد کی آواز سنے گا
سنتے ہیں سبھی لوگ یہاں بات شنیدہ

احساس میں اب سود و زیاں دور پڑا ہے
کھاتے ہیں سبھی نوچ کے یہ لاش بریدہ

انداز شب غم کے بدلتے ہی کہاں ہیں؟
ہوتا ہے نمودار سپیدہ بھی نمیدہ

تھاما ہے مرا ہاتھ تو پھر چھوڑ کے جانا؟
محبوب! مٹھل! یار! نئیں انج کری دا

گو شہر میں جینے کا کوئی ڈھنگ نہیں ہے
زندہ ہیں مگر جبر میں احساس گزیدہ

بے رنگ خزاؤں نے مجھے بانجھ کیا ہے
مہکے ہیں مگر دل میں کئی پھول دمیدہ

چھیڑا ہے ہواؤں نے مرا بندِ قبا بھی
ہر چاک سے نکلے ہیں کئی چاک دریدہ

مٹی کے لبادے میں کوئی حسن رواں تھا
پانی سے کیے دل نے کئی عکس کشیدہ

اس بار مری موجِ غزل کام کرے گی
ریشم کی طرح نرم ہے سوچوں کا ملیدہ

یہ کون سرِ دشت مرے ساتھ چلا ہے
بھاگے چلی جاتی ہے مری جان رمیدہ

مرشد ہے ترا عشق تجھے عشق سے مطلب
سمجھائے تجھے کون محبت کے مریدا!

باہو نے سکھائی ہے محبت مجھے بلھیا!
مسلک ہے مرا عشق دل و جاں سے فریدا!

دنیا کی چکا چوند سے منہ موڑ لیا ہے
دھڑکن میں مچلتی ہے مگر خواہش دیدہ

انسان کی بنیاد محبت پہ رکھی ہے
ہے عشق حقیقت میں مرے رب کا عقیدہ

کیوں حرف حقیقت سے نکلتے نہیں ہمدم
لکھنا ہے مجھے خواب کی مدحت میں قصیدہ

☆

ظلمتِ شب میں سحر زاد پڑا سجتا ہے
خواب سچا ہو تو آنکھوں میں بڑا سجتا ہے

کشتیاں دور کنارے پہ جلی سجتی ہیں
عشق دریا میں تو سوہنی کا گھڑا سجتا ہے

زندگی وقت کے دامن پہ کڑھی بیل نہیں
امتحاں کوئی بھی آئے جو کڑا، سجتا ہے

اچھے لگتے ہیں بہت مجھ کو گلابی گجرے
تیری بانہوں میں نہ چوڑی نہ کڑا سجتا ہے

اُس شہنشاہ کے ٹکڑوں پہ پلا جاتا ہوں
جس کی دہلیز پہ کتا بھی کھڑا سجتا ہے

اپنی اوقات کچھاروں سے نکل کر دیکھو
شیر میدان میں دشمن سے لڑا سجتا ہے

تیری آنکھوں میں جو ہوتا تو قیامت ہوتا
یہ نگینہ جو انگوٹھی میں جڑا سجتا ہے

اس کی تلخی کو محبت سے بدلنا ہو گا
یہ کریلا جو ابھی نیم چڑھا سجتا ہے

موسمِ گل سے محبت کا ہے رشتہ اپنا
دل کے دامن پہ یہی پھول کڑھا سجتا ہے

جس کی چھاؤں میں ٹھہرتے ہیں پرندے اور میں
دھوپ نگری میں وہی پیڑ کھڑا سجتا ہے

بے نمو شاخ سے رشتہ نہیں ٹوٹا لیکن
زرد پتہ تو خزاؤں میں جھڑا سجتا ہے

مجھ سے احساس کی دھرتی نے کہا ہے ہمدم
سبز پرچم مرے سینے میں گڑا سجتا ہے

☆

اے عشق ترا فیض! یہاں جاری کروں گا
میں ہجر کے صحرا میں شجر کاری کروں گا

بازار میں کچھ اور نہیں شے تجھے زیبا
تیرے لیے پھولوں کی خریداری کروں گا

مہکا ہے مرا قریہ ءجاں موجِ صبا سے
خوشبو بھرے لہجے میں سخن کاری کروں گا

صدیوں کی تھکن ایسے اتاروں گا کسی دن
دیکھوں گا کوئی خواب نہ بے داری کروں گا

میں امن کا پنچھی ہوں سو برباد چمن میں
ٹوٹی ہوئی شاخوں پہ عزا داری کروں گا

میں اپنے قبیلے کی روایت کا امیں ہوں
تلوار اٹھاؤں گا ، علم داری کروں گا

مٹی سے اٹھاؤں گا ستاروں کے دیے میں
ظلمت میں چراغوں سے ضیا باری کروں گا

ہنس ہنس کے بتاؤں گا اسے ہجر میں خوش ہوں
وہ جب بھی ملا ایسی اداکاری کروں گا

اس کرب سے گزروں گا تو یہ عہد کیا ہے
آئنہ بناؤں گا نہ زنگاری کروں گا

احساس کا گل دان سجاؤں گا میں ہمدم
خوشبو کے دریچے سے نموداری کروں گا

دیکھوں گا تجھے آئینہ برداری کروں گا
یوں چشمِ تماشا سے میں خودکاری کروں گا

میں پھول کھلاتا ہوا گزروں گا یہاں سے
خوشبو کی سفارت میں جہاں داری کروں گا

امشب مرے ہونٹوں کی کوئی اور طلب ہے
ساقی تری آنکھوں سے نہ مے خواری کروں گا

یہ پھول مرے دستِ سخن سے ہی کڑھیں گے
قرطاس کے آنچل پہ غزل کاری کروں گا

پہلے تو سناؤں گا محبت کا فسانہ
پھر اپنی محبت کا فسوں طاری کروں گا

ہر بار تجھے عقل سے پانے کی سعی کی
اس بار مگر دل کی طرف داری کروں گا

لفظوں میں دکھاؤں گا ترے حسن کا پیکر
محفل پہ عجب سحر ترا طاری کروں گا

زنگار بنا دوں گا سبھی خواب کے منظر
آئنہ ء زدگاں سے جو پیکاری کروں گا

گالوں پہ گلابوں کی ہنسی راج کرے گی
بوسے کے تصور سے وہ گلکاری کروں گا

کس دور سے دل عہدِ وفا باندھ رہا ہے
تو باز نہ آیا تو تجھے کاری کروں گا

خوشبو سے محبت کا تقاضا ہے سو ہمدم
جی بھر کے میں پھولوں کی خریداری کروں گا

☆

پانی میں اپنا عکس دکھایا تھا اور بس
خود کو میں آئنے سے ملایا تھا اور بس

منزل مرے جنون کے پاؤں میں آ گئی
پہلا قدم ہی میں نے اٹھایا تھا اور بس

پھر اس کے بعد زاویے کھنچتے چلے گئے
کاغذ پہ کوئی نقش بنایا تھا اور بس

کتنے چراغ اور مجھے دیکھ کر جلے
میں نے بس اک چراغ جلایا تھا اور بس

آدھا سفر

یہ کیا کہ آندھیوں نے مرا گھر ہی کھا لیا
میں تو ہوا کے ہاتھ میں آیا تھا اور بس

سارے سراب دھوپ سے چھاؤں میں آ گئے
صحرا میں کوئی پیڑ اگایا تھا اور بس

کہ تا کبھی بھی صفر سے آگے نہ بڑھ سکوں
خود کو نفی کیا تھا، گھٹایا تھا اور بس

پہلی کرن تھی خواب دریچے میں آ گئی
پردہ دیارِ دل سے ہٹایا تھا اور بس

تعبیر کی سحر نے اٹھایا نہیں مجھے
بستر پہ ایک خواب سلایا تھا اور بس

پھر یوں ہوا کہ بندِ قبا کھولنا پڑا
دامن کا ایک چاک دکھایا تھا اور بس

☆

خود کو نوائے میر میں لایا تھا اور بس
غالب کا ایک شعر سنایا تھا اور بس

خوشبو تمام شہر میں پھیلی بکھر گئی
موجِ ہوا نے پھول کھلایا تھا اور بس

کھوئے گئے ہم ایسے کہ آنکھیں نہیں کھلیں
خوابوں کا ایک شہر بسایا تھا اور بس

پھر یوں ہوا کہ پیار کی مہلت نہیں ملی
بس ایک پل وفا میں گنوایا تھا اور بس

آدھا سفر

تکمیلِ آرزو میں جہاں سے گزر گئے
یوں عین شین قاف ملایا تھا اور بس

سو میں شکست کھا کے بھی ہارا نہیں کبھی
میں نے جوئے میں خود کو لگایا تھا اور بس

سایہ تمام عمر مری کھوج میں رہا
سورج کو میں نے سر پہ اٹھایا تھا اور بس

پھر اس کے بعد کھیل نہ کھیلا گیا کوئی
تھوڑا سا شوق جی کو چرایا تھا اور بس

کچھ بھی ترے بغیر مکمل نہیں رہا
میں تھا، ترا وجود تھا، سایہ تھا اور بس

ہمدم اسی خیال نے شاعر مجھے کیا
اک خواب زاد شعر میں لایا تھا اور بس

☆

حرف کی زمیں ہم نے اس طرح رفو کی تھی
خوش گوار لہجے میں دل سے گفتگو کی تھی

برف زاد پوروں میں کیوں چنار جلتے ہیں؟
کن سماوراؤں کی ہم نے آرزو کی تھی

اب تو میری آنکھوں پر جام سر جھکاتے ہیں
ساقیا! کبھی میں نے بیعتِ سبو کی تھی

زندگی نے دنیا میں چین ہی نہیں پایا
ہائے! یہ ندیدی بھی کس جہاں کی بھوکی تھی

آدھا سفر

ہم نسب محبت سے ملتے جلتے رہتے تھے
ذکر تھا قبیلے کا بات آبرو کی تھی

ہم سراب سے آگے کس جنوں میں بڑھتے تھے؟
دشت کی مسافت میں کس کی جستجو کی تھی؟

بے نمو بنجر میں خار تک نہیں پھولے
ہائے ! کن خزاؤں میں خواہش نمو کی تھی؟

بار بار تکتا تھا پھر بھی جی نہ بھرتا تھا
آئنہ نما صورت میرے خوب روکی تھی

صرف ایک چہرہ تھا جس کی آرزو لے کر
جستجو محبت کی ہم نے کو بکو کی تھی

اور کون تھا اپنا جس سے حال کہتے ہم
آئنے کی صورت ہی اپنے روبرو کی تھی

عکس تھا محبت کا، رقص تھا عقیدت کا
اور میرے پاؤں میں بے خودی گرو کی تھی

حاشیہ نگاروں نے داستان کی ورنہ
بات سارے قصے میں ایک خوب رو کی تھی

داغ تک نہ باقی تھے صبحِ نو کے چہرے پر
کس نے خواب کی ہستی اس طرح لہو کی تھی

کچھ تو تیرے دشمن بھی دوست ہو گئے میرے
یہ نہیں کہ ہر سازش میرے ہی عدو کی تھی

ہم کنار پانی میں گھل رہے تھے ہم دونوں
تیسرا کنارہ تھا، موجِ آب جو کی تھی

کس طرح بگولے کو جاں پہ روک لیتا میں
اس کی ساری عادت ہی ایک تند خو کی تھی

وہ غزل سراپا تھی ، ہو گئی غزل جس پر
آہ ! کیا ترنم تھا ، طرز کیا گلو کی تھی

چال چل گئی دنیا ، فیصلہ نہ ہو پایا
کون سا عدو ہارا؟ جیت کس عدو کی تھی؟

آج تک مرے پاؤں ٹھیک سے نہیں پڑتے
زندگی زمانے میں ایک بار چوکی تھی

زرد زرد کاغذ پر کس نے خون اگلا تھا؟
دل کی بات آخر کیوں؟ کس طرح سے تھوکی تھی؟

جام پینے والے تو مے کدہ سجا بیٹھے
تشنگی کے ماروں نے صرف ہاؤ ہو کی تھی

آگ جل رہی تھی مگر ہجر کی فضاؤں میں
لمس کی تمازت تھی ، سانس گرم لو کی تھی

جھومتی ہواؤں نے اپنا رخ نہیں بدلا
گھاٹ گھاٹ دھوبی نے ایسی چھوا چھوکی تھی

کس نے موسمِ گل میں یہ ببول بوئے تھے
یہ ہری بھری کھیتی کس نے بے نمو کی تھی

پھول کھل گئے کتنے ریگ زار میں ہمدم
ہم نے خون سے اپنی خاک سرخ رو کی تھی

☆

خوشبو کا ورد ہے یہ وظیفہ ثنائے گل
موجِ غزل کا رنگِ سخن ہے برائے گل

یہ رنگ ، یہ بہار ، یہ موسم اسی سے ہے
گلشن میں اور کیا ہے جو دیکھیں سوائے گل

کانٹے تو خیر عشق کے رستے کی دھول ہیں
دل میں چبھی ہوئی ہے ابھی تک ادائے گل

کہتا ہے کون دشت میں خوئے نمو نہیں
آباد ہم کریں گے جنوں میں سرائے گل

پتے ہرے بھرے ہیں نہ کانٹے نہال ہیں
کس کو ملی ہوئی ہے چمن میں وفائے گل

کھلتے ہیں زخم چاک گریباں کیے ہوئے
دامن کا تار تار ہوا ہے قبائے گل

خاشاک ہیں، سو مفت میں مارے ہی جائیں گے
کانٹوں کی جان لے گی کسی دن قضائے گل

یوں ہی بھری بہار میں گلشن نہیں لٹا
شامل رہی ہے اس میں ہمیشہ رضائے گل

آوارگی ہے بوئے چمن کے فراغ میں
آئے گی راس کس کو بھلا یہ فضائے گل؟

یہ بارگاہِ گل ہے مرے دل ! سو احتیاط !
کانٹوں نے اوڑھ رکھی ہوئی ہے ردائے گل

آ! کوچہء فغاں سے کچھ اس طور سے گزر
اے موجہء نسیم عطا کر غنائے گل

آنکھوں سے پھوٹتی ہے محبت کی روشنی
دل کا دیا جلائے ہوئے ہے ضیائے گل

سیراب کر گئے ہیں چمن کو کچھ ایسے لوگ
جاں سے بھی جو گزر کے رہے نارسائے گل

رستہ بنا رہا ہے مگر زخمی پاؤں سے
کانٹوں کو دیکھتا ہی نہیں آشنائے گل

☆

مٹی کا یہ لباس نہیں ماورائے گل
خوشبو مرا وجود ہے پردہ قبائے گل

غنچہ کھلا ہی تھا کہ جنوں خیز ہم ہوئے
ہے انتہائے شوق یہی ابتدائے گل

سانسوں میں گل بدن کی محبت کا لمس ہے
خوشبو کی پیاس ہے کہ مجھے اشتہائے گل

ویسے تو کائنات میں کیا کچھ نہ تھا مجھے
دل میں اتر سکا نہ کوئی ماسوائے گل

آدھا سفر

مہمیز کر رہی ہے مجھے اور بھی ہوا
احساس کا سفر ہے یہی ارتقائے گل

ایسا نشاط کار کوئی اور بھی ہے کیا؟
جو بھی گیا چمن میں ہوا مبتلائے گل

رنگینیِ بہار ہوئے تتلیوں کے رنگ
گل زار زادیوں نے سنواری قبائے گل

ان کو بھی چومتا ہوں کہ زیبِ چمن تو ہیں
کانٹوں سے دوستی ہے مری ماورائے گل

موجِ ہوا کے دوش پہ خوشبو سفر کرے
دل کا نگر کھلا ہے یہاں آئے جائے گل

گھر میں خزاں رسیدگی چھائی تو کیا ہوا؟
بکھرا ہوا چمن ہے مجھے نینوائے گل

یہ کارواں بہار کا رکتا نہیں کبھی
موجِ صبا رہی ہے یہاں راہ نمائے گل

دل کی حسیں کتاب پہ گل دان رکھ دیا
احساس کی زمین پہ ایسے سجائے گل

تحلیل ہو رہی ہے محبت پون پون
الجھے ہوئے بدن میں عجب لہلہائے گل

ہمدم غزل کروں گا میں جانِ بہار کو
لہجے میں گھل رہی ہے ابھی ہم نوائے گل

☆

سرائے چشم سے آگے بہم نہیں ہوئے تو؟
یہ آئنے کے تماشے ہیں، کم نہیں ہوئے تو؟

امیرِ شہر کی دستار کون دیکھے گا؟
جو سر اٹھا کے جیے ہیں وہ خم نہیں ہوئے تو؟

ہمارے بعد زمانے کا حال کیا ہوگا؟
ہم ایسے لوگ اگر محترم نہیں ہوئے تو؟

غبارِ جسم کے اندر یہ کرچیاں کیسی؟
ہم اپنی ذات میں گر منقسم نہیں ہوئے تو؟

محل پہ خواجہ سراؤں نے راج کرنا ہے
حرم سرا میں جو اہلِ حرم نہیں ہوئے تو!

حسیں بدن کی طرح ہیں مجھے نشیب و فراز
رہے گا کیا جو یہاں زیر و بم نہیں ہوئے تو؟

ہمارا نام نہ ہو گا کسی کہانی میں
عدو کے سامنے اونچے علم نہیں ہوئے تو!

یقین کون کرے گا کہ ہم بھی روتے ہیں
غلافی آنکھ کے پردے جو نم نہیں ہوئے تو؟

انھی سے روز محبت کا باب کھلتا ہے
یہ گوشوارے اگر مختتم نہیں ہوئے تو؟

وطن کی خاک ہمیں بامراد مت رکھنا
نثار تجھ پہ جو تیری قسم نہیں ہوئے تو!

پری رخوں سے مراسم نبھا سکیں گے ہم؟
ہمارے پاس یہ ناز و نعم نہیں ہوئے تو؟

نشاطِ غم سے میسر ہے زندگی ہمدم
خوشی کا لطف رہے گا جو غم نہیں ہوئے تو؟

ہمارے حرف سپرد قلم نہیں ہوئے تو؟
پڑھے گا کون؟ فسانے رقم نہیں ہوئے تو؟

شمارے جائیں گے ہم بھی ہلاک شدگاں میں
ہمارے ساتھ جو شاہِ امم نہیں ہوئے تو!

کہے گا کون کہ ہم اور ہیں، دگر تو ہے
جو من شدی ہیں وہ من تو شدم نہیں ہوئے تو؟

کہاں سے فیصلہ آئے گا؟ کون لکھے گا؟
ہمارے ہاتھ میں سچے قلم نہیں ہوئے تو؟

دلوں کی بانجھ زمیں پر بہار آئے گی
دعا! کہ سبز قدم کے قدم نہیں ہوئے تو؟

کرے گا کون قبیلے کی بات دنیا میں
یہ چند لوگ جو ذی محتشم نہیں ہوئے تو؟

ہمیں تو مار ہی ڈالیں گی رات کی آنکھیں
ہمارے خواب کسی طور کم نہیں ہوئے تو!

ہم اپنے کام کی خبروں سے بے خبر ہوں گے
ہمارے شہر میں اخبار کم نہیں ہوئے تو!

یہ طے ہوا ہے کہ ہم کشتیاں جلا دیں گے
کنارے موج کے سینے میں ضم نہیں ہوئے تو!

یہاں زوال یقینی، عذاب لازم ہے
ستم برائے ستم ہی ستم نہیں ہوئے تو!

دیارِ ہجر سے گزریں گے کس طرح ہمدم
سرائے عشق میں ہم اور دم نہیں ہوئے تو؟

☆

حسین خواب کا منظر حسیں خیال سے ہے
یہ آئنے کا فسانہ پری جمال سے ہے

رفو رفو میں رفو گر ہے تیرا دستِ کرم
عجیب لمس کی خوشبو ترے وصال سے ہے

جنوں کی لہر کنارے پہ لے کے جائے گی
رواں دواں یہ سفینہ اسی اچھال سے ہے

مری نظر کو ملے ہیں یہ خواب ورثے میں
مرا یہ حال بھی جیسے گذشتہ حال سے ہے

سراب زادنگاہیں بھٹک رہی ہیں مگر
فریبِ چشم فقط آئنے کے بال سے ہے

پنپ رہی ہے بغاوت جوان جذبوں میں
یہ مسئلہ بھی مرے ذہن کے ابال سے ہے

کسی کھنڈر سے اٹھایا گیا مکان ترا
ترا عروج مرے شہر کے زوال سے ہے

میں قول و فعل سے پہچانتا ہوں لوگوں کو
ہر ایک ظرف نمایاں ہی چال ڈھال سے ہے

میں غم خرید کے خوشیاں کشید کرتا ہوں
مری خوشی کا تعلق مرے ملال سے ہے

مری کجی سے ملا ہے عروج بونوں کو
امیرِ شہر کی پگڑی مرے زوال سے ہے

میں سبز شاخ سے ٹوٹا ہوا ثمر تو نہیں
مری نمود چمن کے ہر اک نہال سے ہے

میں بے خودی میں حقیقت کا رنگ دیکھتا ہوں
مرا شعورِ قلندر اسی دھمال سے ہے

ترے کمال سے ایسا کمال کرتا ہوں
مرا کمال تمامی ترے کمال سے ہے

میں پور پور لپٹتا ہوں تیری خوشبو سے
مشامِ جاں کا وظیفہ ترے گلال سے ہے

ہم آج بھی جو کھڑے ہیں تو اپنے ماضی پر
ہمارے کل کا تعلق ہمارے حال سے ہے

سخن کی لے میں عقیدت ہو یا محبت ہو
ہر اک اذان کو نسبت کسی بلالؓ سے ہے

جسے بھی تو نے چھوا ہے وہ پھول اور کھلا
سوا ہے موجہء گل جو ترے رومال سے ہے

محبتوں کے فسانے کو کون سمجھے گا؟
یہ بے مثال کہانی تو بے مثال سے ہے

میں اپنے باغ میں ننھا سا ایک پودا ہوں
مری نمود تو مالی کی دیکھ بھال سے ہے

میں کاٹتا ہوں محبت سے مشکلیں ہمدم
مرے جنون کا رشتہ کسی کدال سے ہے

زبانِ خلق میں ہوتی ہے شاعری ہمدم
یہ آگہی تو زمانے کی بول چال سے ہے

☆

آئنہ ہم کو دکھاتا ہے حقیقت کم کم
پھر بھی ہم دیکھتے جاتے ہیں وہ صورت کم کم

عشق کا فرض طریقت سے ادا ہوتا ہے
اس قضیے سے الجھتی ہے شریعت کم کم

میں اسے وقت کی دہلیز پہ چھوڑ آتا ہوں
خواب زدگی سے جو ملتی ہے فراغت کم کم

تیشہ ء دل سے نکلتی ہیں جنوں کی لہریں
پیشہ ء عشق میں جذبہ ہے نہ محنت کم کم

ہر کسی دل پہ کہاں مہر حرا کھلتا ہے؟
عشق والوں پہ اترتی ہے یہ آیت کم کم

یہ مودّت ہے جسے صبر و رضا کہتے ہیں
کربلا والے نہیں کرتے محبت کم کم

جو بھی ہوتا ہے مگر حد سے سوا ہوتا ہے
ہجر واجب ہے محبت میں نہ قربت کم کم

ہم کہاں قیس کے دربار میں ہوتے صاحب
حضرتِ عشق سے رہتی جو نہ صحبت کم کم

ایک تو ہے کہ تری شرط الگ ہے ورنہ
مجھ کو دیتے ہیں سبھی لوگ رعایت کم کم

تیری صورت میں جو تصویر نظر آتی ہے
خواب زادوں نے تراشی ہے یہ جنت کم کم

روز ملتے ہیں مگر مل کے بچھڑ جاتے ہیں
راس آتا ہے ہمیں کنجِ رفاقت کم کم

یہ محبت ہے اسے بندِ قبا سجتا ہے
اک ملاقات میں کھلتی ہے یہ عورت کم کم

سب جسے حسنِ تخیل میں غزل کہتے ہیں
میرے اشعار میں دکھتی ہے وہ مورت کم کم

مال و دولت پہ جھگڑتے ہوئے مر جاتے ہیں
لوگ پاتے ہیں محبت کی وراثت کم کم

ضرب ہوتا ہے یہ تقسیم کنندہ لیکن
منفی ہوتا ہے محبت کا یہ مثبت کم کم

چاک دامن ہی مرا بندِ قبا دیکھتے ہیں
تنگ کپڑوں پہ یہ کھلتی ہے طبیعت کم کم

فقر عزت ہے غریبوں کو ملا کرتی ہے
ہاتھ آتی ہے امیروں کے یہ دولت کم کم

ہجر کا زخم کہاں ہم سے رفو ہوتا ہے
تیری یادوں سے ہی کرتے ہیں جراحت کم کم

کس کو معلوم زمانے کی حقیقت کیا ہے؟
جو بھی سمجھے ہیں سمجھتے ہیں حقیقت کم کم

میری مِیری میں الگ جون پڑی ہے ہمدم
میرے لفظوں میں روایت ہے نہ جدت کم کم

☆

مشکل سی آسان پڑی ہے
تجھ کو دیکھا جان پڑی ہے

گھر تو مرا برباد ہوا تھا
بستی کیوں ویران پڑی ہے

ایک مصیبت سے نکلے تھے
ایک مصیبت آن پڑی ہے

اک دنیا سے واقف ہوں میں
اک دنیا انجان پڑی ہے

آدھا سفر

تاریکی میں چل سکتا ہوں
رستے میں پہچان پڑی ہے

کج اپنی دستار نہ کرنا
اس میں بڑوں کی شان پڑی ہے

حشر سے پہلے حشر بپا ہے
اپنی اپنی آن پڑی ہے

دل کی دھڑکن جھوم اٹھی ہے
کن سازوں میں تان پڑی ہے

دھوپ نگر کی شہزادی کیوں؟
سر پر چادر تان پڑی ہے

دل سجدے میں جھکنے لگا ہے
کان میں کیسی اذان پڑی ہے

آدھا سفر

سورج ڈھلنے کو ہے لیکن
دھوپ سرِ میدان پڑی ہے

خوشبو کے لہجے میں کیا ہے؟
سرگوشی سی کان پڑی ہے

دل کا سودا لیتے جائیں
نئی نئی دکّان پڑی ہے

من میں خوشبو گھول رہی ہے
کان میں اردو زبان پڑی ہے

ترکش میں اک تیر نہیں ہے
ٹوٹی ہوئی سی کمان پڑی ہے

تو پتھر ہے، تیرا کیا ہے؟
کس کو تری بھگوان پڑی ہے

آدھا سفر

پنجرے میں ہیں اڑنے والے
کتنی مہنگی اڑان پڑی ہے

شیشے کی دیوار کبھی تھی
یہ جو رہ میں چٹان پڑی ہے

شوخ حسینہ کافر دنیا
لوٹ مرا ایمان پڑی ہے

بوجھ اٹھانے والا آئے
بڑھیا، لے سامان پڑی ہے

ایک دیے کی لاش ہے لیکن
روکے ہوئے طوفان پڑی ہے

ہونے کو کیا ہو نہیں سکتا
سوچ کیے حیران پڑی ہے

کچے گھڑے کو چھوڑ دے سوہنی!
عشق میں کیوں نادان پڑی ہے؟

چاہت کی یہ خاص گھڑی بھی
گویا اک مہمان پڑی ہے

خواب گزیدہ نم آنکھوں میں
خواہش سی ہلکان پڑی ہے

اتنی جلدی آئے ہو کیا؟
رستے میں ڈھلوان پڑی ہے

بھاگ رہی ہے جان لہو سے
کٹتی ہوئی شریان پڑی ہے

ایک تھے ملنے سے پہلے ہم
دوری کس دوران پڑی ہے

ویرانوں میں قریہ بہ قریہ
آبادی گنجان پڑی ہے

مالک قبر میں جا پہنچا ہے
کوٹھی عالی شان پڑی ہے

اپنا آپ بھلا بیٹھا ہوں
کس کی صورت دھیان پڑی ہے

گل دانوں کی خیر نہیں ہے
خوشبو آ ، دالان پڑی ہے

تیرا شکر ہے میرے مولا
مٹی پاکستان پڑی ہے

آنکھوں میں تصویر کسی کی
کیوں کر بے عنوان پڑی ہے

ہونٹوں پر ہے نام کسی کا
یونہی نہیں مسکان پڑی ہے

شعر کی صورت کیا ہے ہمدم
جو میرے وجدان پڑی ہے

☆

یہ کون مجھے شام و سحر کاٹ رہا تھا
میں سب سے الگ اپنا سفر کاٹ رہا تھا

آسیب کی اُلجھی ہوئی جڑ پھیل رہی تھی
دیوار کے سینے کو شجر کاٹ رہا تھا

نکلا ہے تری یاد کا سورج تو بچا ہوں
یہ ہجر مجھے آٹھوں پہر کاٹ رہا تھا

کچھ حرف اگائے تھے مرے دیدہء تر نے
قرطاس پہ میں فصلِ ہنر کاٹ رہا تھا

آدھا سفر

توفیق مجھے سورۃ الناس کی کب تھی؟
مجھ ایسے بشر کو مرا اشر کاٹ رہا تھا

کوئی تو اٹھاتا تھا قدم میری طرف بھی
کوئی تو مرا آدھا سفر کاٹ رہا تھا

میں اپنے قبیلے کی روایت کا امیں تھا
دستار کا شملہ مرا سر کاٹ رہا تھا

آزاد تو رکھا تھا مجھے اہلِ قفس میں
صیاد مگر سوچ کے پر کاٹ رہا تھا

اس طور مری ذات کی تقسیم ہوئی تھی
احساس میں ہوتا ہوا در کاٹ رہا تھا

بڑھتا چلا جاتا تھا مرے سائے میں لیکن
ہم زاد مری ذات کا ڈر کاٹ رہا تھا

آدھا سفر

نکلا نہ کوئی اور تری ذات سے آگے
اک عمر سے میں لعل و گہر کاٹ رہا تھا

میں ایک جہاں چھوڑ کے گزرا تھا یہاں سے
مجھ کو مری ہجرت کا سفر کاٹ رہا تھا

اک روز تو ہونا تھا مکافات عمل بھی
ظالم کو دعاؤں کا اثر کاٹ رہا تھا

اب ریت نہیں عشق کا دریا ہے یہاں پر
یہ دشتِ جنوں خاک بسر کاٹ رہا تھا

پانی میں فروزاں تھا کوئی جھیل کنارے
تنہائی کے لمحوں میں قمر کاٹ رہا تھا

الزام کسی زید بکر کا مرے سر تھا
ناکردہ گناہوں کا ثمر کاٹ رہا تھا

اس بار مری زہر کے خنجر سے ٹھنی تھی
پتھر کا کلیجہ تھا مگر کاٹ رہا تھا

الجھی ہوئی زلفیں کہ سنورتی ہی نہیں تھیں
درپیش مجھے زیر و زبر کاٹ رہا تھا

کیوں گردشِ ایام کے چکر میں پڑا ہوں
مشکل سے تری راہ گزر کاٹ رہا تھا

کچھ نقش مری آنکھ سے آگے بھی پڑے تھے
آئینہ ءجاں پیشِ نظر کاٹ رہا تھا

باہر کوئی مسموم ہوا ڈسنے لگی تھی
اندر سے مجھے دردِ جگر کاٹ رہا تھا

مٹی ہوئی جاتی تھیں پکائی ہوئی اینٹیں
تہذیب کے آثار کھنڈر کاٹ رہا تھا

ورنہ میں حقیقت سے نگاہیں نہ ملاتا
مجھ کو تو مرا خواب نگر کاٹ رہا تھا

آرا بھی مرے عزم پہ حیران بہت تھا
جب وقت سے مجھے بار دگر کاٹ رہا تھا

حالات کی موجوں پہ مری ناؤ تھی ہمدم
پندار مرا گہرا بھنور کاٹ رہا تھا

شاعر کی مزید کتب

موجِ کرم
حمد و نعت

پانچواں موسم
غزلیات

آئینہ سچ بولتا ہے
غزلیات

موجِ غزل
طرحی غزلیات

محبت کی زبان
طرحی غزلیات

دھوپ کی دیوار
طرحی غزلیات

چراغِ فکر
طرحی غزلیات

جہانِ خواب
طرحی غزلیات

چشمِ تماشا
طرحی غزلیات

مکتبۂ ارمغانِ ابتسام

https://archive.org/details/@nzkiani
nzkiani@gmail.com